مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم پر تنقیدی نظر

(از جناب خان بہادر نواب محمد ذکار اللہ خاں صاحب رٹائرڈ کلکٹر یو۔ پی)

"مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" کے عنوان سے مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی مدیر "ترجمان القرآن" کے مضامین کے دو مجموعے ۱۳۵۷ھ میں اور اُس سے پہلے شائع ہوئے تھے۔ میں نے مولانا کے اُن مضامین پر نیز مولانا کے حامی اور مؤید مولانا منظور صاحب نعمانی کے مضامین پر جو موصوف نے مولانا مودودی صاحب کی تائید میں تحریر فرمائے تھے اسی وقت کچھ تنقیدی مضامین بعنوان "مسلمان اور موجودہ سیاسی جنگ" لکھے تھے جس میں سے بعض ترجمان القرآن میں اور بعض دیگر رسالوں میں ابتداءً شائع ہوئے اور جن میں سے بعض کا جواب بھی مولانا مودودی صاحب نے دیا اور اُن میں سے چار مضامین ایک رسالہ کی صورت میں بھی شائع ہو چکے ہیں (دیکھو میرا رسالہ "مسلمان اور موجودہ سیاسی جنگ" مطبوعہ لطیفی پریس دھلی)۔ مولانا مودودی صاحب نے اپنے مضامین میں (جو پہلے مجموعہ میں شائع ہوئے ہیں) سیاسی کام کرنیکے اکثر ان طریقوں کو غلط اور مسلمانوں کے لیے مضر ثابت کرنے کی کوشش کی تھی جن پر مسلمانوں کے مختلف گروہ عمل پیرا ہیں۔ مگر خود اپنا نصب العین اور اپنا طریقہ کار مسلمانوں کے سامنے پیش نہیں کیا تھا[1]۔ لہٰذا مسلمانوں کو عموماً اور ترجمان القرآن کے ناظرین کو خصوصاً مولانا

---

[1] اُسی کتاب میں تین مستقل باب سیاسی نصب العین، راہِ عمل اور قرآن و اسوۂ رسول کی رہنمائی کے عنوان پر موجود ہیں، اور پھر شبہات اور جوابات کے عنوان سے نصب العین اور طریق کار کی مزید توضیح بھی کی گئی ہے مگر خان بہادر صاحب فرماتے ہیں کہ کوئی نصب العین اور طریق کار پیش نہیں کیا گیا۔ یہ عجیب طرز بحث ہے۔ اگر آپکا دل کسی چیز کو قبول نہیں کرتا تو راست بازانہ طریقہ یہ ہے کہ آپ صاف کہدیں کہ جو کچھ تم نے پیش کیا وہ ہمیں قبول نہیں۔ لیکن بجائے یہ کہنے کے آپ یہ کہتے ہیں کہ تم نے سرے سے کوئی چیز پیش ہی نہیں کی۔ م

موصوف سے یہ شکایت تھی کہ[۱] اگر مسلمان مولانا کے تخریبی استدلال سے متاثر ہو کر دیگر سیاسی گروہوں سے اشتراک عمل ترک کردیں تو ایسا کرنیکے بعد خود کیا کریں؟ آیا معطل ہو کر بیٹھ جائیں یا کوئی نیا طریقہ کار اختیار کریں؟ مسلمانوں کے اس احساس کی ترجمانی کرتے ہوئے راقم الحروف نے ایک استفسار مولانا ممدوح کی خدمت میں روانہ کیا تھا جس میں علاوہ اور باتوں کے مولانا سے دریافت کیا گیا تھا کہ

(۱) موجودہ سیاسی جنگ میں مسلمانوں کو کیا طریقہ کار اختیار کرنا چاہیے؟

(۲) اسمبلیوں اور کونسلوں کے انتخاب کا وقت اگر آوے اس کے لیے مسلمانوں کو اپنا نمایندہ کھڑا کرنا چاہیے یا نہیں؟

(۳) اگر کھڑا کرنا چاہیے تو وہ نمایندہ کانگریسی ہو یا مسلم لیگی؟

(۴) اگر کسی ایک جگہ کے لیے دو نمایندے کھڑے ہوں ایک کانگریسی دوسرا مسلم لیگی تو عام رائے دہندگان کو کانگریسی امیدوار کو رائے دینا چاہیے یا مسلم لیگی امیدوار کو؟

(۵) اگر ایسے انتخاب کے وقت مسلمانوں کو نہ کانگریسی امیدوار کو رائے دینا چاہیے نہ مسلم لیگی امیدوار کو تو مسلمانوں میں کوئی تیسری جماعت ہے کہ مسلمانوں کو اسکے امیدوار کو رائے دینا چاہیے؟ اگر ہے تو وہ کونسی جماعت ہے؟

(۶) اگر مسلمانوں کی کوئی سیاسی جماعت میدانِ سیاست میں ایسی موجود نہیں ہے جو اسکی اہل ہو کہ اسکے نمایندہ کو مسلمانوں کو رائے دینا چاہیے تو کیا آپ کی رائے ہے کہ مسلمانوں کو اس وقت ان انتخابات میں حصہ لینے سے اور ان اسمبلیوں اور کونسلوں میں اپنے نمایندے بھیجنے سے پرہیز کرنا چاہیے اور مسلمانوں کو تعطل کی پالیسی اختیار کرنا چاہیے؟ اگر ایسا ہے تو آپ کو صاف صاف اظہار

---

[۱] اپنی شکایت کو آخر عام شکایت قرار دینے کی کیا ضرورت ہے؟ آپ کے پاس یہ معلوم کرنے کا ذریعہ کیا ہے کہ یہ شکایت عام تھی؟ - م

کر دینا چاہیے؟ ......

اسی کے ساتھ آپکو یہ بھی صاف صاف کہدینا چاہیے کہ جن صوبوں میں مسلمان اکثریت میں ہیں اور ان صوبوں کی وزارتیں مسلمانوں کے ہاتھ میں ہیں ان وزارتوں سے مسلمانوں کو استعفاء دیدینا چاہیے اور ان صوبوں کی وزارتوں پر بھی غیر مسلموں کو قابض ہو جانے دینا چاہیے یا نہیں؟

یہ استفسار راقم الحروف نے مولانا مودودی صاحب کی خدمت میں ایک خط کی صورت میں روانہ کیا تھا اور درخواست کی تھی کہ مولانا موصوف اس استفسار کو معہ اپنے جواب کے ترجمان القرآن میں مسلمانوں کی اطلاع کے لیے شائع فرما دیں۔

مولانا مودودی صاحب نے نہ میرا استفسار ترجمان القرآن میں شائع فرمایا نہ اس کا کوئی جواب دیا۔[۱] اگرچہ جس پالیسی کے مولانا مودودی صاحب اپنے مضامین کے پہلے مجموعہ میں حامی تھے اسکے دیکھتے ہوئے مولانا مودودی صاحب کا اخلاقی فرض تھا کہ وہ میرے استفسار کو اور نیز اسکے جواب کو ترجمان القرآن میں عام مسلمانوں کی اطلاع کے لیے شائع فرماتے۔[۲]

مولانا کا میرے استفسار کو نہ شائع فرمانا اور اسکے جواب سے پرہیز کرنا دو وجوہ پر مبنی ہو سکتا

[۱] ایک شخص مکہ کی طرف جانے کی تجویز پیش کرتا ہے اور اسکی ضرورت، اسکے مصالح اور راستہ کی تفصیلات بیان کرتا ہے - آپ اسکی ساری تقریر سننے کے بعد اٹھ کر پوچھنا شروع کرتے ہیں کہ ٹوکیو کے راستے میں فلاں فلاں ضرورتیں پیش آئینگی انکا کیا بندوبست ہوگا؟ اور کلکتہ سے جو جہاز مشرق کو جاتے ہیں ان میں سے کونسا بہتر ہے؟ اور ٹوکیو کے کس محلہ میں قیام مناسب ہوگا؟ خدارا بتایئے کہ ایسے سوالات کا کیا جواب دیا جائے - آپکے سوالات سے ہی معلوم ہو گیا کہ پوری تقریر کے دوران میں آپ ٹوکیو ہی کا خواب دیکھتے رہے اور جو کچھ دوسرا کہہ رہا تھا اسکی طرف آپکا دھیان گیا ہی نہیں - اب کس امید پر آپکو جواب دیا جائے - جو جواب بھی دیا جائیگا اس میں آپ پھر ٹوکیو ہی ٹوکیو تلاش کرینگے - م

[۲] یعنی اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کرنا بھی میرے فرائض میں سے ہے! - م

ہے - اولاً یہ کہ مولانا کے پاس اس کا کوئی جواب ہی نہ تھا۔[1] ثانیاً یہ کہ جس جمود و تعطل کی طرف مولانا ممدوح کی تحریریں مسلمانوں کو لیجانا چاہتی تھیں اوس جمود و تعطل سے مولانا اپنے مصالح کی بنا پر مسلمانوں کو (جن کا علم مولانا ہی کو ہوسکتا ہے) نکالنا نہیں چاہتے تھے۔[2] اگر پہلی صورت تھی تو مولانا مودودی صاحب پر لازم تھا کہ اس کا اعتراف فرماتے - اور اگر دوسری صورت تھی تو اس سے رجوع فرماتے - مگر مولانا نے ایسا نہیں کیا (میرا استفسار مذکور میرے رسالہ "مسلمان اور سیاسی جنگ" میں بطور تتمہ اول کے شائع ہو چکا ہے) - مولانا مودودی صاحب نے اگرچہ میرے استفسار کو نہیں شائع کیا نہ اس کا جواب دیا تاہم اپنے سیاسی مضامین کے دوسرے مجموعہ میں مولانا نے اپنا نصب العین نہایت وضاحت کے ساتھ پیش کر دیا تھا - اسکے حاصل کرنیکے طریقہ کے متعلق مولانا کا ارشاد تھا کہ وہ نصب العین بغیر انقلابی ذرائع اختیار کیے ہوئے حاصل نہیں ہوسکتا - میں نے اپنے دو مضامین میں جن میں سے اول "ترجمان القرآن" میں بھی چھپ چکا ہے اور نیز میرے رسالہ "مسلمان اور سیاسی جنگ" میں بطور تتمہ ثانی کے چھپا ہے اور دوسرا الہلال دہلی میں چھپا ہے مولانا مودودی صاحب سے ان انقلابی ذرائع کے معلوم کرنیکی ہر چند کوشش کی مگر میں مولانا سے کوئی تشفی بخش جواب حاصل کرنے میں ناکام رہا۔[3] مولانا فرماتے ہیں "میں حیران ہوں کہ اس کا کیا جواب دوں جب تک

---

[1] بلاشبہ سوالات لاجواب تھے - م

[2] یقیناً اگر مسلمان کسی کی طرف چلنے پر راضی نہ ہوں تو میں اپنی حد تک انتہائی کوشش کروں گا کہ وہ کیو کی طرف ایک انچ نہ بڑھنے پائیں - م

[3] اُسی وقت عرض کر دیا گیا تھا کہ انقلابی ذرائع کی فہرست بنا کر پیش نہیں کی جایا کرتی - یہ ریفارم اسکیم نہیں ہے، نقشۂ جنگ ہے - اسکا صرف اصولی خاکہ پیش کیا جاسکتا ہے تفصیلات از ابتدا تا انتہا پہلے ہی قدم پر مرتب نہیں کی جاسکتیں - مگر مشکل یہ ہے کہ خان بہادر صاحب کسی طرح اس بات کو سمجھ نہیں سکتے کیونکہ انکے ذہن کی پوری ساخت برطانوی ہند کے دستور کا نسٹی ٹیوشن پر ڈھلی ہوئی ہے اور الکشن، کونسل، ووٹ اور سیاسی خاندان کی دوسری چیزوں کے باہر اُن کا تصور کسی طرف جا ہی نہیں سکتا - م

قوم کی ایک بڑی تعداد ایک نصب العین پر متحد نہ ہو جائے اور ہر قیمت پر اسے حاصل کرنیکا عزم صمیم اس میں نہ پیدا ہو جائے ۔ انقلابی ذرائع کی ایک فہرست پیش کر دینا کسی یاوہ گو ہی کا کام ہو سکتا ہے اور میں یاوہ گوئی سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں"۔

بہر حال مولانا کے مضامین کے پہلے مجموعہ نے مسلمانوں کو جس جمود اور تعطل کی حالت میں ڈالنے کی کوشش کی تھی مولانا کے مضامین کے دوسرے مجموعہ نے اسکی کسی طرح تلافی نہیں کی بلکہ اس جمود اور تعطل کو اپنی جگہ اور مضبوط کر دیا۔ اور یہی جمود اور تعطل کی پالیسی ہے جسکے خلاف میں نے اپنے جملہ مضامین میں جو رسالہ "مسلمان اور سیاسی جنگ" میں شائع ہوئے ہیں صدائے احتجاج بلند کی ہے۔

اب مولانا مودودی صاحب کے مضامین "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" کا حصہ سوم جو ذی الحجہ سنہ ۱۳۵۹ھ کے ترجمان القرآن میں شائع ہوا ہے اور نیز مولانا کے مضامین کا وہ مجموعہ جو محرم سنہ ۱۳۶۰ھ کے ترجمان القرآن میں شائع ہوا ہے میرے پیش نظر ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ مضامین بھی کوئی تعمیری پہلو لیے ہوئے ہیں یا اُن میں بھی سوائے تخریب کے اور جمود و تعطل کی تعلیم کے اور کچھ نہیں ہے[1]۔ ان مضامین پر تبصرہ کرتے ہوئے ممکن ہے کہ مجھکو مولانا کے مضامین سے طویل اقتباسات ہدیہ ناظرین کرنا پڑیں جسکی میں ناظرین کرام سے پہلے ہی سے معافی چاہتا ہوں "اصلی مسلمانوں کے لیے ایک ہی راہ عمل" کا عنوان قائم کر کے مولانا مودودی صاحب فرماتے ہیں :-

---

[1] "جمود" اور "تعطل" خان بہادر صاحب کی مخصوص اصطلاحیں ہیں جن کا مفہوم سمجھنے میں شاید ناظرین کو زحمت پیش آئے۔ دراصل خان بہادر صاحب کسی ایسی حرکت کو سرے سے حرکت ہی تسلیم نہیں کرتے جو اُس راستہ پر نہ ہو جس پر وہ خود چل رہے ہیں اس کے جانب مخالف کی طرف جو حرکت ہو اس کا نام انکی اصطلاح خاص میں جمود اور تعطل ہے اگر وہ مشرق کی طرف جانا چاہتے ہوں اور دوسرا ان سے اختلاف کر کے مغرب کی طرف چل پڑے تو خواہ وہ غریب کتنی ہی تیز رفتاری سے چل رہا ہو مگر خان بہادر صاحب کہینگے کہ وہ چل ہی نہیں رہا، جامد کھڑا ہے۔ م

(دیکھو ترجمان القرآن محرم ۱۳۶۰ھ صفحہ ۱ تا صفحہ ۱۱)

"اسلام تمام عالم انسانی کے لیے بنیادی اصلاح کا ایک پیغام اور عملی اصلاح کا ایک پروگرام لیکر آیا ہے - اسکا پیغام یہ ہے کہ تمام انسان اللہ وحدہٗ لاشریک کی حاکمیت تسلیم کریں حتی کہ اسکے حکم کے سوا ہر دوسرا حکم باطل ہو جائے - اور اس کا پروگرام یہ ہے کہ انسانوں میں سے جو لوگ اس دعوت کو قبول کریں وہ ایک جتھا بنا کر اپنا پورا زور اس بنیادی اصلاح کو عملاً نافذ کرنے میں صرف کر دیں یہانتک کہ اشخاص کی، خاندانوں کی طبقوں کی، قوموں کی اور نسلوں کی فرمانروائی اور جمہور کی حکومت خود اختیاری بالکلیہ مٹ جائے اور خدا کی سلطنت میں اسکی رعیت پر صرف اسی کا قانون عملاً جاری ہو"

(۲) "مسلمانوں کی مختلف سیاسی جماعتوں پر مجھے جو کچھ اعتراض ہے وہ یہی ہے کہ وہ اپنے کو مسلم (یعنی متبعین انبیاء) کہنے کے باوجود انہوں نے اس نصب العین اور اس راہ عمل کو چھوڑ کر ایسے مقاصد اور طریقے اختیار کیے ہیں جنکو اسلام سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہیں ہے"

(۳) "یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ قومیت اور قومی اغراض قابلِ تبلیغ چیزیں نہیں ہیں - مثلاً جرمنیت، اطالویت، انگریزیت یا ہندویت کے متعلق کوئی شخص یہ تصور بھی نہیں کر سکتا کہ انکی طرف دوسروں کو دعوت دی جا سکتی ہے - یہ کوئی اصول نہیں ہیں کہ ہر انسان کے سامنے انکو پیش کیا جا سکے - یہ تو نسل، تاریخ، تمدن کے بنے ہوئے بے لچک دائرے ہیں"

(مشکل یہ ہے کہ مولانا مودودی صاحب کو اپنے نظریات اور اپنے مسلمات یاد نہیں رہے ورنہ وہ نہ فرماتے کہ ہندویت یا انگریزیت میں کوئی قوت تبلیغ نہیں ہے - بس مولانا کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ اپنے مضامین کے مجموعہ میں جہاں وہ مسلمانوں کو کانگریس کی شرکت کے خدشات سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں وہاں وہ صاف الفاظ میں تحریر فرماتے ہیں کہ اگر مسلمانوں کا کانگریس اور ہندو اکثریت

کے ساتھ اس قسم کا اشتراک عمل رہا جو اس وقت اُن مسلمانوں کا ہے جو کانگریس کے ساتھ اشتراک عمل کے حامی ہیں تو کچھ تعجب کی بات نہیں ہے کہ آج جو مسلمان اپنے آپ کو عبداللہ کے نام سے یاد کرتے ہیں ایک دو نسلوں کے بعد رام دیو کے نام سے یاد کیے جانے لگیں اور جو مسلم خواتین اس وقت صالحہ کے نام سے موسوم ہیں وہ ایک دو نسلوں کے بعد شریمتی بملا دیوی اور شریمتی سیتا دیوی کہلائی جایا کریں۔ اسی طرح انگریزی یا مغربی تمدن بھی تبلیغی روح سے بالکل معرا نہیں ہے۔ چنانچہ ایک جگہ سیاسی کشمکش حصہ اول میں مولانا کا ارشاد ہے:

"سیاسی اقتدار سے محروم ہونے کے بعد جاہ و عزت کی بھوک پیدا ہوئی اور معاشی وسائل سے محروم ہونیکے بعد روٹی کی بھوک۔ ان دونوں چیزوں کے حصول کا ذریعہ صرف ایک ہی رکھا گیا اور وہ مغربی تعلیم کا دروازہ تھا۔ روٹی اور عزت کے بھوکے لاکھوں کی تعداد میں ادھر لپکے۔ وہاں ہاتف غیب نے پکار کر کہا کہ آج روٹی اور عزت مسلمان کے لیے نہیں ہے۔ یہ چیزیں اگر چاہتے ہو تو نامسلمان بن کر آؤ۔"

سیاسی کشمکش حصہ دوم کے دیباچہ میں مولانا فرماتے ہیں۔

"مغربی تعلیم کے تجربہ سے کیا ثابت ہوا؟ یہ کہ جو ماحول ہم پر مسلط ہے اس میں سے محض ایک عنصر یعنی تعلیم کو ہم دوسرے عناصر سے الگ کر کے نہیں لے سکتے۔ دوسرے عناصر جنکے ساتھ اس عنصر کا غیر منفک رابطہ ہے خود بخود اسکے ساتھ آتے ہیں ...... اور ان سب کے جمع ہو جانے سے مسلمان خود بخود نامسلمان بنتا چلا جاتا ہے۔"

مولانا کے مضامین کے اِن اوپر کے اقتباسات سے خود ثابت ہوتا ہے کہ ہندویت اور انگریزیت بھی کچھ نہ کچھ تبلیغی روح اپنے اندر رکھتی ہیں اور اگر ایسا نہیں ہے، اگر وہ تبلیغی روح سے بالکل معرا ہیں تب تو ہم مسلمانوں کو ہندوؤں یا انگریزوں سے زندگی کے کسی شعبہ میں خواہ وہ تعلیم ہو

یا تجارت، سیاست ہو یا مدنی معاشرت، اشتراکِ عمل کرنے سے احتراز کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ یہ قومیں بقول مولانا ممدوح کے اپنے میں کوئی تبلیغی روح رکھتی ہی نہیں ہیں، اسلیے وہ ہم مسلمانوں پر کوئی اچھا یا برا اثر نہیں ڈال سکتیں۔ اگر ہمارے اور ان قوموں کے اشتراک عمل کا کوئی نتیجہ نکل سکتا ہے تو یہی کہ وہ ہمارے تبلیغی مشن سے کچھ نہ کچھ متاثر ہو جائیں، وہو المقصود)[1]

[1] یہاں خان بہادر صاحب نے تبلیغی جذب و کشش کو سیاسی جہانگیری اور قومی جہانگیری کے طریقوں سے خلط ملط کر دیا ہے حالانکہ یہ تینوں چیزیں بالکل مختلف نوعیت رکھتی ہیں۔ تبلیغی جذب و کشش کی نوعیت یہ ہے کہ انسانوں کی ایک جماعت محض چند اصول لیکر اٹھتی ہے، اور بلا امتیازِ قومیت و نسل و وطن تمام انسانوں کے سامنے ان اصولوں کو پیش کرتی ہے اور جو کوئی انکو قبول کرے اسے بالکل اس طرح اپنا لیتی ہے کہ نئے آنے والے رکن اور پرانے ارکان کے درمیان کسی حیثیت سے بھی کوئی فرق و امتیاز نہیں ہوتا بلکہ وہ ان میں مل کر یکجان ہو جاتا ہے۔ اسکی پرانی مثالیں اسلام، بودھ مت اور مسیحیت میں ملتی ہیں، اور اسکی نئی مثال بین الاقوامی اشتراکی تحریک میں مل سکتی ہے۔ سیاسی جہانگیری کی نوعیت یہ ہے کہ ایک ظالم قوم جب کسی غیر ملک پر قبضہ کرتی ہے تو اسکی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس ملک کے باشندوں میں کوئی قومی غیرت، کوئی احساسِ خودی اور کوئی عزتِ نفس باقی نہ رہے اور وہ اپنے آپ کو خود حقیر و ذلیل اور اپنے آقاؤں کو ہر کمال کا مظہر سمجھنے لگیں، تاکہ انکو آسانی سے محکوم بنا کر رکھا جا سکے۔ اس غرض کے لیے وہ اپنی تعلیم اور اپنی تہذیب ایک خاص طریقہ سے ان میں پھیلاتی ہے اور انکی اپنی قومی خصوصیات کو مٹا کر انکو زندگی کے ہر شعبے میں اپنا نقال بنانے کی کوشش کرتی ہے قومی جہانگیری یہ ہے کہ ایک خود غرض قوم جب ایک ہی سرزمین میں دوسری قوموں کو اپنے ساتھ رہتے بستے پاتی ہے اور اس کا جی چاہتا ہے کہ اس سرزمین کے سارے منافع اور وہاں حکومت کرنے کے سارے اختیارات بلا شرکتِ غیرے تنہا اسی کے قبضہ میں رہیں، تو وہ پہلے تو یہ کوشش کرتی ہے کہ ان دوسری ہم وطن قوموں کو فنا کر دے، جیسا کہ فرنگیوں نے امریکہ میں کیا، اور جب اس میں ناکامی ہوتی ہے یا ایسا کرنا خلافِ مصلحت معلوم ہوتا ہے تو وہ اُن قوموں کو ہضم کرنے کی کوشش کرتی ہے اور اس غرض کے لیے وہ سیاسی اقتدار سے کام لیکر ان قوموں کی

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۱۱۰ ملاحظہ ہو)

(۴) "دراصل ایک ملک پر نہیں بلکہ ساری دنیا پر چھا جانے کی قوت اگر ہے تو وہ صرف

(بقیہ حاشیہ ص ۱۰۹) خصوصیات کو مٹانے اور اپنی خصوصیات اُن پر مسلط کرنے کی مختلف تدبیریں اختیار کرتی ہے، جسکی مثال مملکت روس کی غیر روسی قوموں کو روسی بنانے (Russification) کی وہ کوششیں ہیں جو عہد زارمیں کی جارہی تھیں۔

میں نے سیاسی کشمکش حصہ اول و دوم میں انگریزوں اور ہندوؤں کی طرف جس چیز کو منسوب کیا ہے وہ تبلیغی جذب و کشش نہیں ہے بلکہ سیاسی جہانگیری اور قومی جہانگیری ہے۔ انگریز اور جرمن اور دوسری جہانگیر قومیں انگریزیت یا جرمنیت نامی کسی مذہب و مسلک کی تبلیغ نہیں کرتی ہیں، بلکہ صرف حکمرانی کی اغراض کے لیے دوسری قوموں کو بدقوما بنانے (Denationalise کرنے) کی کوشش کرتی ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ کوئی غیر انگریز یا غیر جرمن انکی زبان و تہذیب میں خواہ کتنا ہی رنگ جائے مگر بہرحال وہ انگریز یا جرمن نہیں بن سکتا۔ اسی طرح روسیوں نے وسط ایشیا میں جو پالیسی اختیار کی اور جس کو ہمارے ہندو ہموطن ہندوستان میں اختیار کرنا چاہتے ہیں اسکی نوعیت بھی کسی اصولی تبلیغ کی نہیں ہے بلکہ وہ ایک قوم کی طرف سے دوسری قوموں کو کھا جانے کی ایک جابرانہ اور فریب کارانہ کوشش ہے جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دوسری قوموں کی امتیازی ہستی فنا ہو جائے اور یہ قوم اُن کو اپنا جزو بدن بنا کر طاقت حاصل کرے۔ اس دوسری شکل میں بھی عموماً وہ قومیں جنکو اس طرح شکار کیا جاتا ہے مساوی حیثیت سے اس قوم میں شامل نہیں ہوتیں بلکہ صرف بیہوش (Unconscious) کر کے مسخر کرلی جاتی ہیں اور بظاہر ایک قوم بن جانے پر بھی ان میں آقا اور غلام کا تعلق باقی رہتا ہے جیسا کہ شودروں کے معاملہ میں علانیہ دیکھا جا سکتا ہے۔

میں نے اپنی کتاب کے پہلے دونوں حصوں میں مسلمانوں کو انگریزوں اور ہندوؤں کے اسی ناجائز طرزعمل پر چوکنا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اور تیسرے حصہ میں ان کو یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ ان دونوں ظالموں کے مقابلے میں اگر تم نیشنلزم کے اصولوں پر جدوجہد کرو گے تو خائب و خاسر رہو گے۔ ان ہتھیاروں سے نہ صرف یہ کہ تمہارا ان کے مقابلہ میں کامیاب ہونا محال ہے، بلکہ درحقیقت مسلمان ہونے کی حیثیت سے یہ ہتھیار تمہارے شایان

ایک ایسی اصولی تحریک ہی بن ہے جو انسان کو بحیثیت انسان کے خطاب کرتی ہو اور اس کے سامنے خود اسکی فلاح کے فطری اصول پیش کرتی ہو۔ قومیت کے برعکس ایسی تحریک ایک تبلیغی طاقت ہوتی ہے ...... اگر واقعہ یہی ہے اور مسلمانوں کی اصلی حیثیت ایک عالمگیر اصولی تحریک کے پیرؤوں اور داعیوں کی ہے تو وہ سارے مسائل یک قلم اُڑ جاتے ہیں جن پر اب تک مسلمانوں کے سیاسی و مذہبی رہنما وقت ضائع کرتے رہے ہیں۔ مسلم لیگ، احرار، خاکسار، جمعیت العلماء اور آزاد مسلم کانفرنس سب کی اس وقت تک کی کارروائیاں حرفِ باطل کی طرح محو کر دینے کے لائق ٹھہرتی ہیں۔ نہ ہم قومی اقلیت ہیں، نہ آبادی کے فی صدی تناسب پر ہمارے وزن کا انحصار ہے، نہ ہندوؤں سے ہمارا کوئی قومی جھگڑا ہے، نہ انگریزوں سے وطنیت کی بنیاد پر ہماری لڑائی ہے، نہ وہ حکومت ہمارے کسی کام کی ہے جو انگریز کی حاکمیت کے بجائے جمہور کی حاکمیت پر مبنی ہو، نہ اقلیت کے تحفظ کی ہمیں ضرورت ہے، نہ اکثریت کی بنا پر ہمیں قومی حکومت مطلوب ہے۔ ہمارے سامنے تو صرف ایک مقصد ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ کے بندے اللہ کے سوا

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۱) شان بھی نہیں ہے۔ اس راہ چلنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دنیا سے بھی نامراد ہو جاؤ گے اور آخرت میں بھی نامراد ہی رہو گے۔ بخلاف اسکے اگر تم اپنے اس تبلیغی مشن کو لے کر کھڑے ہو جاؤ جو مسلمان ہونے کی حیثیت سے دراصل تمہارا مشن ہے تو یکایک میدان کا رنگ بدل جائیگا۔ بجائے اسکے کہ تم کسی کی سیاسی اور کسی کی قومی جہانگیری کے خوفناک حملوں کا ہدف بنو اور لرزو، یہ سارے جہانگیر تم سے کانپنے لگینگے اور صرف یہی نہیں کہ دنیا میں تم غالب ہو گے بلکہ آخرت میں بھی تم ہی سرخرو ہو گے۔ مجھے افسوس ہے کہ یہ سیدھی سی بات اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں کی سمجھ میں بھی نہیں آتی۔ کھول کھول کر بتا رہا ہوں کہ قوم پرستانہ طریقوں اور اصولی تبلیغ کے طریقوں میں کیا فرق ہے، مقدم الذکر کے اختیار کرنے میں کیا غلطی ہے اور اسکے نقصانات کیا ہیں، اور موخر الذکر کا اختیار کرنا کس طرح صحیح و معقول بھی ہے اور نتیجہ خیز بھی۔ پھر زیادہ سے زیادہ وضاحت کے ساتھ یہ بھی بتا رہا ہوں کہ اگر نیشنلزم کی بنیاد سے ہٹا کر اپنی ساری سرگرمیوں کو اسلام کے تبلیغی مشن کی بنیاد پر قائم کرنا چاہو تو یہ ترتیب جدید (Readjustment) کس طرح ممکن ہے۔ مگر اللہ کے بندے صرف یہی نہیں کہ بات سمجھتے نہیں بلکہ لوگ تو اس جرم کی پاداش میں مجھ پر ایسے عجیب عجیب الزام تراش رہے ہیں جنہیں سن کر ہنسی آتی ہے۔

کسی کے محکوم نہ ہوں، ہندوؤں کی حاکمیت ختم ہو جائے اور حکومت اس قانون عدل کی قائم ہو جو اللہ تعالیٰ نے خود بھیجا ہے۔ اس مقصد کو ہم انگریز، والیان ریاست، ہندو، سکھ، عیسائی، پارسی اور مردم شماری کے مسلمان سب کے سامنے پیش کرینگے، جو اسے قبول کریگا وہ ہمارا رفیق ہے، اور جو اس سے انکار کریگا اُس سے ہماری لڑائی ہے، بلا لحاظ اسکے کہ اس کی طاقت کتنی ہے اور ہماری کتنی۔ بلا شبہ اس سے ہمیں بہت کچھ نقصانات پہونچینگے مگر ایسے نقصانات اُٹھائے بغیر اسلامی تحریک نہ کبھی چلی ہے نہ کبھی چل سکتی ہے۔ جو کچھ جاتا ہے جانے دو۔ سید نا مسیح کے بقول جُبّہ جاتا ہے تو کرتا بھی چھوڑنے کے لیے تیار رہو جاؤ، تب ہی خدا کی بادشاہت زمین پر قائم ہوگی۔"

(۵) اسی طرح اس سوال کے جواب میں کہ "اصل اسلامی نصب العین کیا ہے" مولانا فرماتے ہیں:

"اس سوال کا جواب قرآن مجید میں جو دیا گیا ہے وہ یہ ہے۔ هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ۔ اس آیت میں الہدیٰ سے مراد دُنیا میں زندگی بسر کرنیکا صحیح طریقہ ہے ...... دوسری چیز جو اللہ کا رسول لیکر آیا ہے وہ دین حق ہے۔ دین کے معنی اطاعت کے ہیں۔ کیش اور مذہب کے لیے جو دین کا لفظ استعمال ہوتا ہے یہ اسکا اصل معنی موضوع لہ نہیں ہے۔ دراصل دین کا لفظ وہی معنی رکھتا ہے جو زمانہ حال میں لفظ "اسٹیٹ" کے معنی ہیں۔ لوگوں کا کسی بالاتر اقتدار کو تسلیم کر کے اسکی اطاعت کرنا، یہ اسٹیٹ ہے، یہی دین کا بھی مفہوم ہے۔ اور "دین حق" یہ ہے کہ انسان دوسرے انسانوں کی، خود اپنے نفس کی اور تمام مخلوقات کی بندگی چھوڑ کر صرف اللہ کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرے۔ پس درحقیقت اللہ کا رسول اپنے بھیجنے والے کی طرف سے ایک ایسے اسٹیٹ کا

کا نظام لیکر آتا ہے جس میں نہ تو انسان کی خود اختیاری کے لیے کوئی جگہ ہے نہ انسان پر انسان

کی حاکمیت کے لیے کوئی مقام، بلکہ حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ جو کچھ بھی ہے صرف اللہ کے لیے ہے ...... پھر رسول کے بھیجنے کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ وہ اس نظام اطاعت (دین) اور اس قانونِ حیات (الہدیٰ) کو پوری جنس دین پر غالب کردے"

اس اسلامی نصب العین تک پہونچنے کا سیدھا راستہ مولانا کے نزدیک یہ ہے:

"اس نصب العین کی طرف پیش قدمی کرنیکے لیے راہ راست وہی ہے جو اللہ کے رسول نے اختیار کی، یعنی یہ کہ لوگوں کو "الہدیٰ" اور "دینِ حق" کی طرف دعوت دی جائے، پھر جو لوگ اس دعوت کو قبول کرکے اپنی بندگی اور اطاعت کو اللہ کے لیے خالص کردیں، دوسری اطاعتوں کو اللہ کی اطاعت کے ساتھ شریک کرنا چھوڑ دیں اور خدا کے قانون کو اپنی زندگی کا قانون بنالیں انکا ایک مضبوط جتھا بنایا جائے، پھر یہ جتھا دین حق کو قایم کرنیکے لیے جہاد کبیر کرے، یہاں تک کہ اللہ کے سوا دوسری اطاعتیں جن جن طاقتوں کے بل پر قائم ہیں ان سب کا زور ٹوٹ جائے۔

اس راہِ راست کے تین جزء ہیں۔

(۱) انسانوں کو بالعموم اللہ کی حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ تسلیم کرنے اور اس کے بھیجے ہوئے قانون کو اپنی زندگی کا قانون بنانے کی دعوت دی جائے۔

(۲) جتھا صرف ان لوگوں کا بنایا جائے جو اس دعوت کو جان کر اور سمجھ کر قبول کریں۔

(۳) تیسرا جزء یہ ہے کہ براہ راست غیر الٰہی نظام اطاعت پر حملہ کیا جائے"

ناظرین کرام نے مولانا کی تحریر سے اقتباسات مندرجہ بالا ملاحظہ فرمائے۔ ان تحریروں میں مولانا نے کس قدر ہوشیاری سے خلط مبحث کے ذریعہ سے مسلمانوں کی جملہ سیاسی جماعتوں کو عوام کی نظروں میں مردود و مغبوض قرار دینے کی کوشش فرمائی ہے[1]۔ جب مسلمانوں کا

[1] ماشاء اللہ! اس سلامت قلب و ذوق کی بھی کوئی (۱۱۳) حد ہے کہ مذکورہ بالا عبارات میں آپ کو "ہوشیاری"

نصب العین زمین پر خدا کی بادشاہت قائم کرنا ہے یا ہونا چاہیے اور یہ مسلمانوں کی موجودہ سیاسی جماعتیں اسکو اپنا نصب العین قرار نہیں دیتیں تو وہ ضرور قابل احتراز و اجتناب ہیں۔ مگر مولانا ممدوح اس امر کو فراموش کر دیتے ہیں کہ مسلمانوں کی موجودہ سیاسی جماعتیں مسلمانوں کو مسلمان سمجھ کر انکی تنظیم کا انتظام کرتی ہیں، وہ مسلمانوں کو نامسلمان یا مرتد قرار دے کر انکی تنظیم کا ادعا نہیں کرتیں کہ ان جماعتوں کے لیے یہ ضرور ہو کہ وہ مسلمانوں کو پہلے مسلمان بنالیں اسکے بعد ان کی تنظیم کریں۔ اگر موجودہ مسلمان نامسلمان یا مرتد نہیں ہیں اور اُن میں کچھ بھی ایمان کی رمق باقی ہے اور ان کا نصب العین زمین پر خدا کی بادشاہت قائم کرنا ہے تو وہ اپنی نئی تنظیم کے بعد خواہ وہ مسلم لیگ کے طریقہ پر ہو خواہ احرار خاکسار اور جمعیت العلماء کے زیر اثر ہو اپنے نصب العین کے حصول کے زیادہ اہل بن جاوینگے مسلم لیگ یا دیگر موجودہ سیاسی جماعتیں مسلمانوں سے یہ نہیں کہتیں کہ تم اپنے کسی نصب العین کو جو ممدوح و مطلوب ہو ترک کردو۔ نہ وہ ایسے نصب العین کے حصول میں کسی طرح مزاحم ہوتی ہیں[۱]۔ اگر مولانا مودودی صاحب کے نزدیک آجکل کے "مردم شماری" کے مسلمان مسلمان نہیں ہیں بلکہ نامسلمان ہیں اور وہ کوئی پسندیدہ نصب العین نہیں رکھتے اور اس کی ضرورت ہے، کہ ان کو نامسلمان سے مسلمان

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۳) "خلط مبحث" اور "سیاسی جماعتوں کو مبغوض بنانے کی کوشش" کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ خان بہادر صاحب مجبور ہیں کہ اس قسم کی عبارتوں میں کوئی دوسری چیز وہ پا نہیں سکتے کیونکہ کسی نئی چیز کے اخذ کرنے کی منزل سے وہ گذر چکے ہیں، اور اب اگر کوئی ایسی چیز وہ دیکھتے ہیں جو ان کے لیے نئی ہو تو اسکے اندر انکو وہی پرانی باتیں نظر آتی ہیں جن سے وہ مانوس رہے ہیں۔ م

[۱] ان ساری باتوں کا جواب میری کتاب سیاسی کشمکش حصہ سوم میں موجود ہے۔ خصوصاً صفحات ۲ تا ۴۳، ۵۸ تا ۵۹، ۶۴ تا ۹۶، ۱۰۳ تا ۱۰۴، ۱۰۷، ۱۱۰ تا ۱۱۸، ۱۳۱ تا ۱۳۴، ۱۳۷ تا ۱۴۹ کوئی پڑھے تو اس قسم کے اعتراضات اسکے ذہن میں پیدا ہو ہی نہیں سکتے مگر جب کوئی شخص دوسرے کی عبارت میں اپنے مفروضات اور ظنون و اوہام پڑھنے لگے تو اسکے اعتراضات کا رفع ہونا قطعی محال ہے اس سلسلہ میں تنہا ایک خان بہادر صاحب ہی نہیں، متعدد حضرات کی طرف سے مجھے ایسا تلخ تجربہ ہوا ہے کہ اب یہ کہنے کی ہمت نہیں ہوتی کہ میری فلاں فلاں عبارتیں پڑھ لیجیے۔ م

بنایا جاوے اور اُن کے سامنے ایک پسندیدہ نصب العین رکھا جاوے تو مولانا مودودی صاحب اور اُنکے ہم خیال بزرگ آویں اور مسلمانوں کو اصلی معنی میں مسلمان بناویں اور اُن کے سامنے پسندیدہ نصب العین[1] رکھیں مسلم لیگ یا کوئی دوسری جماعت ہرگز کسی ایسے اقدام میں مولانا کی مزاحم نہیں ہوگی بلکہ جہاں تک ہو سکیگا اُنکی ممد و معاون ثابت ہوگی[2]۔ خدارا خود بھی کچھ کام کیجیے اور دوسروں کو بھی کام کرنے دیجیے۔ یہ کونسی خدمت دین یا اسلام ہے کہ نہ خود کچھ کریں نہ دوسروں کو کرنے دیں[3]

مولانا کا یہ نظریہ کہ موجودہ "مردم شماری کے" یا "نسلی" مسلمان دراصل مسلمان نہیں ہیں اور اُن میں ایمان کی کوئی رمق باقی نہیں ہے سرے سے غلط ہے[4]۔ انہیں مردم شماری کے مسلمانوں کے افراد میں مولانا حسین احمد مدنی بھی ہیں مولانا عبید اللہ سندھی بھی ہیں مولانا اشرف علی صاحب

---

[1] آئیں اور بنائیں اور رکھیں کیا معنی؟ میں تو یہ کام کر ہی رہا ہوں۔ جس کتاب پر جناب اس قدر شدت کے ساتھ تنقید فرما رہے ہیں وہ بھی اسی سلسلہ کا ایک کام ہے۔ م

[2] غالباً جناب کی یہ تنقید سلسلۂ معاونت ہی ہے! اور شائد یہ بھی معاونت ہی کی کوئی قسم ہے کہ اس وقت لیگ کے حلقوں میں میرے خلاف بے اصل الزامات اور غلط فہمیوں کی اشاعت کا ایک طوفان برپا ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ آپ مزاحمت نہ کریں، بلکہ میں چاہتا ہوں کہ جب آپ مزاحمت کرتے ہیں تو اس قسم کے چلتے ہوئے عوام فریب فقرے نہ لکھیے۔ مزاحمت کیجیے اور صاف کہیے کہ ہم تیری مزاحمت کرینگے۔ م

[3] دراصل میں اس ذہنیت کو سمجھنے سے بالکل عاجز ہوں جسکے تحت اس قسم کے فقرے کہے اور لکھے جاتے ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی مسلک میں غلطی دیکھتا ہے اور اسکی اصلاح کی کوشش کرتا ہے، یا اسکی غلطی واضح کر کے اپنے نزدیک جو بہتر مسلک سمجھتا ہے اسے اختیار کرنے کا لوگوں کو مشورہ دیتا ہے تو آخر اس کا یہ مطلب کیسے ہوگیا کہ وہ نہ خود کچھ کرنا چاہتا ہے اور نہ دوسروں کو کچھ کرنے دیتا ہے؟ آخر کیوں غلط کو غلط نہ کہا جائے اور جس چیز کو آدمی صحیح سمجھتا ہو اسکی طرف کیوں نہ دعوت دے؟ آپ ایک ایماندار آدمی سے اس مداہنت کی توقع کیوں کرتے ہیں کہ جس طریقہ کو وہ حق کے خلاف پاتا ہے اس کی خرابیاں لوگوں کو سمجھانے کی کوشش نہ کرے؟ — م

[4] یہ آخر میں نے کب کہا کہ ساری قوم غیر مسلم ہوگئی ہے اور اس میں ایمان کی رمق بھی باقی نہیں؟ میں نے تو ان اعتقادی اور اخلاقی بیماریوں کو کھول کر بیان کیا ہے جو بالعموم مسلمانوں میں اس وقت پائی جاتی ہیں اور جن کی وجہ سے مسلمان تنزل اور کمزوری میں مبتلا ہیں۔ ان بیماریوں کا جائزہ لینے کی کوئی غرض اسکے سوا نہیں ہے کہ ان کا جو صحیح اصولی علاج ہے اسکی ضرورت و اہمیت

(بقیہ صفحہ ۱۱۶ پر)

تھانوی بھی ہیں، مولانا سید سلیمان ندوی بھی ہیں اور اگر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کو ان مردم شماری کے مسلمانوں کا ایک فرد ہونا باعث عار نہیں ہے تو وہ خود بھی اسی برادری کے ایک فرد ہیں اور انہی جیسے ہزاروں دوسرے خدا کے بندے، اسی امت مرحومہ کے افراد ہیں اور اس کا فرد ہونا اپنے لیے باعث صد عزت و افتخار خیال کرتے ہیں۔ اگر ان میں سے سب یا بعض اس کے اہل ہیں کہ وہ مسلمانوں کے سامنے فرض کفایہ کی تعمیل میں اسلام کا صحیح نصب العین رکھیں تو وہ ضرور ایسا کریں گے اور امت محمدیہ اسکو اختیار کریگی اور اسکے حصول کی کوشش کرے گی۔ اگران "نسلی" یا "مردم شماری" کے مسلمانوں میں کچھ بھی نور ایمان اور جذبہ اعلاء کلمۃ اللہ باقی ہے تو وہ جذبہ ضرور کچھ نہ کچھ اپنا اثر دکھائے گا خواہ انکی تنظیم مسلم لیگ کے طریقہ پر ہو خواہ کسی دوسرے طریقہ پر۔ بہر نوع مسلمانوں کی یہ تنظیم کسی ایسے جذبہ کو روک نہیں سکتی نہ اسکا یہ ادعاء ہے کہ وہ اسکو روکے گی بلکہ ہر امکانی طریقہ سے اس جذبہ کو ابھارے گی۔ یہ دراصل ایک سخت مغالطہ ہے کہ مسلمانوں کی اگر مسلم لیگ کے یا کسی دوسری سیاسی جماعت کے طریقہ پر تنظیم ہو جائے تو مسلمانوں میں اگر کوئی جذبہ اپنی دینی یا دنیاوی اصلاح کا ہے یا کوئی ولولہ اعلاء کلمۃ اللہ کا ہے وہ سرد پڑ جائیگا یا یہ تنظیم اسکی مزاحم ہوگی یا اسکو روک دیگی۔[۲] آخر کوئی وجہ بھی تو سمجھ میں آوے کہ اگر ہم مسلمانوں میں کوئی جذبہ اپنی دینی یا دنیاوی اصلاح کا کارفرما ہے یا آئندہ کو کارفرما ہو تو مسلمانوں کی سیاسی تنظیم اس جذبہ کو کیوں بجھا دیگی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۵) ان لوگوں کو محسوس کرائی جائے جو اس قوم کے اندر صحیح العقیدہ و صالح العمل ہیں۔ میری اس کوشش کو غلط پیرایہ میں تعبیر کر کے آپ لوگ مسلمانوں کو دھوکا کیوں دیتے ہیں؟ کیا مسلم لیگ کا کام اِن خلاف اخلاق و دیانت تدبیروں کے بغیر نہیں چل سکتا۔ ـــ م

[۱] بشرطیکہ آپ جیسے حضرات صد عن سبیل اللہ کی کوششوں سے باز رہیں اور بیچاری امت محمدیہ کو غلط فہمیوں میں مبتلا نہ کریں۔ م

[۲] میں اپنے مضمون "اسلام کی راہ راست اور اس سے انحراف کی راہیں" میں تفصیل کے ساتھ بتا چکا ہوں کہ یہ غلط طرز تنظیم کس طرح اسلامی مقاصد کے خلاف ہے۔ م

یہ مغالطہ اگر مولانا مودودی صاحب کو نادانستہ ہے تو درخواست کرونگا کہ وہ اپنے استدلال کے مقدمات اور نتائج پر نظر ثانی فرمادیں اور اگر دیدہ و دانستہ وہ مغالطہ میں پڑے ہوئے ہیں اور مسلمانوں کو بھی مغالطہ میں ڈالنا چاہتے ہیں تو میری درخواست ہوگی کہ وہ اس سے تائب ہوں۔ دراصل یہ مغالطہ اُس غلط مبحث کا نتیجہ ہے جسکے مولانا مودودی صاحب عادی ہیں۔ مسلمانوں کو موجودہ سیاسی دور میں سیاسی تنظیم کی ضرورت ہے۔ ایک جماعت یا چند جماعتیں انکی سیاسی تنظیم کے لیے کھڑی ہوتی ہیں۔ اس وقت یہ بحث ہی بالکل غیر متعلق ہے کہ مسلمان اس وقت کیسے مسلمان ہیں، "دو نسلی" ہیں یا اصلی۔ اُنکا اسلام اور ایمان صحابہ رضی اللہ عنہم جیسا ایمان و ایقان ہے، یا آجکل کے عرب بدوؤں جیسا، یا ہندو ریاستوں کے نو مسلموں جیسا۔ سیاسی تنظیم کے وقت موجودہ مسلمانوں کے ایمان کی قوت و ضعف کی بحث ہی غیر متعلق ہے۔ تنظیم تو موجودہ مسلمانوں کی کی جاتی ہے خواہ وہ اچھے ہیں یا برے۔ ان کا اسلام قوی ہے یا ضعیف۔ مسلمانوں کی ایک جماعت محسوس کرتی ہے کہ ان میں تنظیم نہیں ہے، وہ انکی تنظیم کرنا چاہتی ہے۔ آپ محسوس کرتے ہیں کہ اُن کا اسلام صحیح اسلام نہیں، ان کا ایمان قوی نہیں ہے۔ آپ ان میں صحیح اسلام کی روح پھونکنے کی کوشش کیجیے اور ان کے اخلاق، اطوار، عادات درست کرنے کی کوشش کیجیے۔ آپ اُن میں وہ صفات پیدا کرنے کی کوشش کیجیے جو کہ ایک پکے مومن میں ہونا چاہییں۔ آپ اپنا کام کیجیے۔ جو جماعتیں مسلمانوں کی تنظیم کا کام کرنا چاہتی ہیں انہیں وہ کام کرنے دیجیے۔ آپکے کام میں اور ان کے کام میں نہ کوئی تصادم کی وجہ ہے نہ ہونا چاہیے۔ بلکہ آپ ان کے اور وہ آپ کے کام میں ممدو معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ کسی جماعت سے جو مسلمانوں کی فلاح کا ایک کام کرنا چاہتی ہے یہ کہنا کہ تم مسلمانوں کی فلاح کے دوسرے کام کیوں نہیں کرتے بے عقلی نہیں تو اور کیا ہے[1]۔ ہاں اگر موجودہ "دو نسلی"

[1] یہ تمام سطحی باتیں ہیں جو بلا تفکر و تدبر کہی جا رہی ہیں۔ آپکے نزدیک اصل معاملہ ایک قوم کی "فلاح" کا ہے اور اس فلاح (بقیہ صفحہ ۱۱۸ پر)

مسلمان مودودی صاحب کے نزدیک بالکل نامسلمان ہیں اور ان میں شمہ بھر ایمان باقی نہیں ہے تو بات ہی دوسری ہے ۔ تاہم ان کی تنظیم کے کام پر بھی مولانا مودودی صاحب کو اعتراض کا حق نہیں پہنچتا کیونکہ وہ نامسلمان ہیں ان کی تنظیم یا عدم تنظیم سے ایک سچے اور اصلی مسلمان کو کیا سروکار ۔ مسلم لیگ اور مسلمانوں کی دیگر سیاسی جماعتوں کا مقصد اولیٰ اس وقت سیاسی تنظیم ہے ۔ اگر یہ مقصد فی نفسہ مذموم ہے تو ضرور آپ مسلمانوں کو ان سیاسی جماعتوں سے کلی احتراز و اجتناب کی ہدایت کیجیے ۔ لیکن اگر یہ مقصد بذاتہ حسن اور ممدوح ہے تاہم اگر آپ اپنی تقریر اور تحریر کے ذریعہ سے مسلمانوں کو ان سیاسی جماعتوں کی شرکت سے روکتے ہیں اور اس ذریعہ سے ان سیاسی جماعتوں کی قوت

(بقیہ حاشیہ ص ۱۱۷) کی مختلف صورتیں آپکے ذہن میں ہیں جنکے درمیان باہم کسی ربط کی ضرورت نہیں ۔ آپ اس طرح سوچ رہے ہیں کہ کوئی اس قوم کی معاشی فلاح کا شعبہ سنبھال لے اور دنیا میں جو معاشی طریقے چل رہے ہیں انکے مطابق اس کی خوشحالی کے لیے کوشش کرے ، کوئی دوسرا اسکی سیاسی فلاح کا شعبہ سنبھالے اور دنیا میں جن طریقوں سے قومیں اپنی سیاسی تنظیم کیا کرتی ہیں انہی میں سے کسی طریقہ کو اختیار کر کے اسے منظم کر ڈالے ، کوئی تیسرا اسکی اخلاقی فلاح کا شعبہ سنبھالے اور پکارنا شروع کرے کہ آؤ بھائیو اسلام کی طرف ۔ پس آپکے نزدیک اسلام اس قوم کی خدمت کے مختلف محکموں میں سے ایک محکمہ ہے اور دوسرے محکموں کے ساتھ بغیر کسی تصادم کے یہ اسی طرح چل سکتا ہے کہ دوسرے محکموں میں جن اصول ، جن طریقوں اور جس لیڈرشپ کے تحت کام ہو رہا ہے ان سے یہ کوئی تعرض نہ کرے اور بس اپنے نماز روزے سے غرض رکھے ۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ لفظ مسلمان اگر کوئی معنی رکھتا ہے تو اس معنی کے لحاظ سے اسلام مسلمانوں کی زندگی کا ایک ڈپارٹمنٹ نہیں ہو سکتا بلکہ اس کو انکی زندگی کے تمام شعبوں پر فرمانروا ہونا چاہیے ۔ ان کی سیاست ، انکی معیشت ، ان کی تعلیم ، ان کے اخلاق ، ان کے اندرونی معاملات اور خارجی تعلقات سب اسلام کے ماتحت ہونے چاہییں ۔ دین کی ہدایت اور دین ہی کا ضابطہ ہو جو انکی زندگی کے مختلف شعبوں کو چلائے ۔ انکی سیاست دین کی رہنمائی میں چلے ، دوسری قوموں اور طاقتوں کے ساتھ انکے معاملات دین کی رہنمائی میں انجام پائیں ، انکی ساری جد و جہد دین کے نصب العین کے لیے ہو ، اور انکا کوئی قدم اس راہ سے ہٹ کر نہ اٹھے جو دین نے انکے لیے متعین کی ہے ۔ یہ تخیل رکھنے کی وجہ سے میں بالکل مجبور ہوں کہ ہر اس طرزِ عمل کی مخالفت کروں جو مسلمانوں کو مجرد ایک گروہ اشخاص سمجھ کر اختیار کیا جائے ۔ م

توڑنا یا کم کرنا چاہتے ہیں تو آپ اسلام اور مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچاتے ہیں۔ اگر ان سیاسی جماعتوں کا ایک متعین مقصد ہے تو ان سے یہ کہنا کہ تم کوئی دوسرا مقصد کیوں پورا نہیں کرتیں ایسا ہی ہے جیسا کہ اگر کوئی جماعت مسلمانوں کی تعلیم کا کام اپنے ذمہ لے اور اس سے کہا جائے کہ تم مسلمانوں کی اقتصادی حالت کیوں درست نہیں کرتیں۔ یا کوئی جماعت مسلمانوں کی اقتصادی حالت کی درستی کا کام کرنے کے لیے اٹھے اس سے کہا جائے کہ تم مسلمانوں کے مذہبی عقائد کی اصلاح کیوں نہیں کرتیں اور جو بدعات مسلمانوں میں رائج ہو گئی ہیں ان کا استیصال کیوں نہیں کرتیں۔ مودودی صاحب نے مسلمانوں کے نصب العین کی بحث چھیڑ کر مسلمانوں کو موجودہ سیاسی جماعتوں سے دور رکھنے کی کوشش تو ضرور کی مگر حسب عادت مسلمانوں کو یہ نہیں بتایا کہ اگر مسلمان ان سیاسی جماعتوں کی شرکت سے احتراز کریں تو آخر موجودہ سیاسی جنگ کے متعلق کیا طریقہ کار اختیار کریں۔

(۱) آیا وہ انگریز یا ہندو اکثریت کے ساتھ اشتراک عمل کریں یا ان کے ساتھ عدم تعاون کی پالیسی اختیار کریں۔

(۲) آیا ملک میں جو کانسٹی ٹیوشن اس وقت جاری ہے یا آئندہ جاری ہو اس میں مسلمان کوئی حصہ لیں یا اس میں حصہ لینے سے احتراز کریں اور حکومت جیسی کچھ بھی اس وقت جاری ہے یا آیندہ جاری ہو اس پر غیر مسلموں کو قابض ہو جانے دیں اور مسلمانوں کا اس حکومت میں کوئی حصہ نہ ہو[1]۔

[1] خان بہادر صاحب نے میری کتاب کے جو اقتباسات خود اپنے اس مضمون کی ابتدا میں پیش فرمائے ہیں انکے اندر ان سوالات کا جواب موجود ہے مگر جو تخیلات انکے ذہن پر مسلط ہیں انکی وجہ سے وہ کوئی جواب ان عبارتوں میں نہ پا سکے اور ساری داستان سن کر آخر میں پوچھا تو یہی پوچھا کہ زلیخا مرد تھی یا عورت تھا۔ حضرت! میری پوزیشن یہ ہے کہ قرآن کی طرف سے ایک پیغام تمام انسانوں کے لیے میرے سپرد کیا گیا ہے اور اس پیغام کو مجھے ہندو، انگریز، جرمن، روسی، ہر ایک کے سامنے

(بقیہ صفحہ ۱۲۰ پر)

(۳) کانگریسی خیال کے مسلمانوں کا جو مسلک ہے کہ ہندوؤں کے ساتھ اشتراک عمل کر کے ہندوستان کی آئندہ حکومت قایم ہونا چاہیے یا مسلم لیگ کی جو پاکستانی اسکیم ہے ظاہر ہے کہ یہ دونوں اسکیمیں مولانا مودودی صاحب کے نزدیک مردود و مبغوض ہیں تو ان کی بجائے کونسی اسکیم مولانا مودودی صاحب پیش کرتے ہیں؟ وہ اسکیم ضروری تفصیل کے ساتھ عام فہم الفاظ میں پبلک کے سامنے پیش کریں تاکہ عام مسلمان اسکو سمجھ سکیں اور اگر وہ قابلِ عمل ہے تو اس کو اختیار کر سکیں۔ اس قسم کی مبہم اپیلوں سے کہ جو کچھ جاتا ہے جانے دو، سیدنا مسیح کے بقول "جبہ جاتا ہے تو کرتا بھی چھوڑ نیکے لیے تیار ہو جاؤ تب ہی خدا کی بادشاہت زمین پر قائم ہو سکیگی" تو کام چلتا نہیں نہ عوام کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیا کریں اور کیا نہ کریں[1]۔ اس قسم کی ہدایت اور رہنمائی کا تو سوائے اسکے کوئی اور نتیجہ نہیں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۹) پیش کرتا ہے۔ میرے لیے ہندوستان میں برطانوی دستور، اور جرمنی میں نیشنل سوشلسٹ دستور، اور روس میں اشتراکی دستور، سب کی ایک ہی حیثیت ہے۔ میں سب کو غلط سمجھتا ہوں۔ ان دستوروں کے تحت جو نظام حکومت بنتے ہیں وہ میرے نزدیک خنزیر کی طرح حرام ہیں۔ اس حرام چیز پر اگر غیر مسلم قابض ہو جائیں تو ہو جائیں۔ غیر مسلم ہونے کی حیثیت سے یہ حرام چیز ہے ہی ان کیلیے۔ میرا کوئی مفاد اس سے وابستہ نہیں ہے۔ میں تو ان سب کو حاکمیت رب العالمین کی طرف دعوت دونگا اور ان سے کہونگا کہ اس بغاوت سے باز آؤ جو اپنے خدا سے تم کر رہے ہو، تمہاری اپنی فلاح اس میں ہے کہ اپنے بنائے ہوئے یہ سب کانسٹی ٹیوشن توڑ دو اور خدا کا بنایا ہوا کانسٹی ٹیوشن قبول کرو۔ اگر میری بات مانو گے تو سعادت دنیوی و اخروی سے ہمکنار ہو گے، اور نہیں مانتے تو اِنَّا بُرَآءُ مِنْکُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ کَفَرْنَا بِکُمْ وَبَدَا بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ

اَبَدًا حَتّٰی تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ۔ م

[1] جس کتاب میں یہ "مبہم اپیل" کی گئی ہے اسی میں چند صفحات آگے چل کر پوری اسکیم بھی اپنی ضروری تفصیلات کے پیش کر دی گئی ہے۔ مگر خان بہادر صاحب کی عادت یہ ہے کہ جس چیز کو قبول نہیں کرنا چاہتے اسکے وجود ہی سے انکار کر دیا کرتے ہیں۔ اس طرح بحث بھی مختصر ہو جاتی ہے اور فریق مخالف کو الزام دینے میں بھی آسانی ہوتی ہے۔ م

ہو سکتا کہ مسلمان مسلم لیگ اور دیگر سیاسی جماعتوں سے بدظن ہو کر ان سے اشتراک عمل ترک کر دیں اور پھر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائیں۔

(۴) جیسا کہ میں اوپر عرض کر چکا ہوں مولانا مودودی صاحب کا ارشاد ہے کہ اسلام کی راہ راست کے اجزار یہ ہیں۔

(۱) انسان کو بالعموم اللہ کی حاکمیت و اقتدار اعلیٰ تسلیم کرنے کی دعوت دی جائے۔

(۲) دوسرا جز یہ ہے کہ جتھا صرف ان لوگوں کا بنایا جائے جو اس دعوت کو جان کر اور سمجھ کر قبول کریں۔

(۳) تیسرا جز یہ ہے کہ براہ راست غیر الٰہی نظام اطاعت پر حملہ کیا جائے۔

راہ راست کے متعلق یہاں تک جو کچھ مولانا نے بیان فرمایا وہ تو صاف ہے[۱]۔ مگر اسکا آگے کا حصہ مولانا نے بالکل مبہم چھوڑ دیا۔ سوال یہ ہے کہ یہ جتھا جو مولانا کی تجویز کے مطابق بنایا جائیگا اسکا تعلق موجودہ کانسٹی ٹیوشن یا نظام حکومت سے یا آئندہ جو کانسٹی ٹیوشن بھی ملک میں قائم ہو اس سے کچھ ہوگا یا نہیں؟[۲] موجودہ کانسٹی ٹیوشن جو اب تک قائم ہے یا آئندہ جو کانسٹی ٹیوشن قائم ہو اس میں یہ جتھا کوئی حصہ لیگا یا نہیں؟ اگر لیگا تو ظاہر ہے یا تو اس طریقہ پر لیگا جسکے مؤید کانگریسی مسلمان ہیں یعنی یہ کہ مولانا کا یہ جتھا غیر مسلموں کے ساتھ اشتراک عمل کر کے کوئی نیا نظام حکومت قائم کرے۔ یا یہ جتھا مسلم لیگ کی پاکستانی اسکیم اختیار کرے۔ اس صورت میں مولانا کے اس جتھے کے سامنے اکثریت اور اقلیت، فوج میں اور سرکاری ملازمتوں میں اور انتخابی مجالس میں اپنی نمائندگی کے متعلق وہ سب سوالات آجائینگے جن سے مولانا مودودی صاحب مسلمانوں کو بحیثیت مسلمان کلی اجتناب و احتراز کرنے

---

[۱] الحمد للہ کہ ایک بات تو صاف ہوئی۔ م

[۲] جی ہاں، دشمنی، مخالفت اور تخریب کا تعلق ہوگا۔ ہم اس سے تعاون نہیں کرینگے بلکہ اسے بدلنے کی کوشش کرینگے۔ م

کی ہدایت فرماتے ہیں۔

اگر یہ مولانا کا جتھا موجودہ نظام حکومت یا کانسٹی ٹیوشن میں یا اس نظام حکومت یا کانسٹی ٹیوشن میں جو آئندہ قائم ہو کوئی حصہ نہیں لیگا تو کیا یہ جتھا ہر اس نظامِ حکومت سے جو ملک میں قائم ہو علیحدہ رہکر کام کریگا؟ اس صورت میں ظاہر ہے کہ اس جتھے کو ملک کے نظام حکومت میں کوئی دخل نہ ہوگا مگر اس کے ساتھ اس جتھے کو ملک کے نظام حکومت کا ماتحت اور محکوم ہو کر رہنا پڑیگا اس وقت تک جب تک کہ یہ جتھا ملک کے کل نظام حکومت کو ترغیب کے ذریعہ سے اپنا ہم خیال نہ بنالے یا تشدد کے ذریعے سے نہ الٹ دے اور خود اس نظام حکومت پر بلا شرکت غیرے قابض نہ ہو جائے۔ مگر جب تک یہ جتھا ایسا کرنے میں کامیاب نہیں ہوتا اس وقت تک اس جتھے کے تعلقات ملک کے نظام حکومت کے ساتھ کیا ہونگے؟ آیا اس جتھے کے افراد ملک کے قائم شدہ نظام حکومت کو ٹیکس دیا کرینگے یا نہیں؟ اور آیا اس جتھے کے افراد ملک کے مروجہ قانون کی پابندی کرینگے یا نہیں؟ اگر ان سوالات کا جواب اثبات میں ہے تو ظاہر ہے کہ مولانا کا یہ جتھا ملک کے قائم شدہ نظامِ حکومت سے ہر قسم کا تعاون کرتا ہے لہٰذا اس جتھے کے طریقہ کار میں اور ان مسلمانوں کے طریقۂ کار میں جو غیر مسلموں کے ساتھ

؎ اگر کوئی شخص گندے پانی کے تالاب میں گر گیا ہو اور وہ اس سے نکلنا چاہے تو کیا کریگا؟ آیا وہ تیر کر نکلنے کے لیے اسی گندے پانی میں ہاتھ پاؤں ماریگا یا پاک پانی تلاش کریگا؟ اس دوران میں کہ وہ اس تالاب کے اندر گرا ہوا ہے وہ اپنے جسم کو گندگی لگنے دیگا یا نہیں؟ اگر وہ پانی اسکے کان، ناک اور منہ میں گھس جائے تو اس سے وہ کس طرح بچیگا؟ ان تمثیلی سوالات پر اگر خان بہادر صاحب غور کریں تو انکی سمجھ میں پوری بات آجائیگی۔ جو جماعت کسی بگڑے ہوئے نظام کو بدلنے کے لیے اٹھتی ہے، ابتداءً اسے اپنی ساری جدوجہد انہی بگڑے ہوئے حالات کے اندر کرنی پڑتی ہے اور بہت سی وہ چیزیں جنکو وہ اصولاً ناجائز سمجھتی ہے احالات کے جبر سے اس پر مسلط رہتی ہیں۔ انکو مجبوراً برداشت کرنیکے معنی اس نظام سے تعاون کرنیکے نہیں ہیں۔ وہ اپنی حد امکان تک اس نظام اور اسکی ہر چیز سے عدم تعاون اور عملاً جنگ کریگی، مگر جن چیزوں سے بچنا ناممکن ہوگا انہیں با دلِ ناخواستہ گوارا کریگی۔ —م

اشتراک عمل کر کے کوئی نظام حکومت بنانا چاہتے ہیں کوئی فرق نہیں ہے سوائے اس کے کہ مولانا کا یہ جتھا ملک کے قائم شدہ نظام حکومت کے ساتھ بطور ایک محکوم کے تعاون کرتا ہے اور دوسرا گروہ اس کے ساتھ بطور ایک حکومت کے حصہ دار کے[1] اگر ان سوالات کا جواب نفی میں ہے تو مولانا کے اس جتھے کی پالیسی قائم شدہ حکومت کے ساتھ خواہ وہ انگریزوں کی ہو یا ہندو اکثریت کی ہو وہی ہوگی جو کچھ عرصہ پہلے کانگریس کی تھی یا اب بھی ہے۔ مگر کانگریس نے عدم ادائے ٹیکس کا کبھی اعلان نہیں کیا نہ اس بات کا اعلان کیا کہ وہ ملک کے عام قوانین کی قانون شکنی کرینگے۔ مولانا کو اس کا اعلان بھی کرنا ہوگا کہ ان کے جتھے کے افراد ملک کے ٹیکس ادا کرینگے یا نہیں اور ملک کے قوانین مجریہ کی پابندی کرینگے یا نہیں۔ بہر حال اس باب میں مولانا کا جو طریقہ کار ہو اس کا مولانا کو صاف الفاظ میں اعلان فرما دینا چاہیے تاکہ جو کوئی بھی مولانا کے اس جتھے میں شامل ہونا چاہے وہ جان بوجھ کر شامل ہو۔ کسی مغالطہ کے تحت شامل نہ ہو[2]

اس وقت تک جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ مولانا مودودی صاحب کے اعتراضات کا جو ملک کی سیاسی جماعتوں پر انہوں نے کیے ہیں اجمالی جواب ہے۔ آئندہ جو کچھ مجھکو عرض کرنا ہے وہ یہ ہے کہ مولانا نے اپنے ان مضامین میں جو اپنے نظریات پیش کیے ہیں وہ کہاں تک صحیح ہیں۔ جیسا کہ میں

---

[1] یوں کہیے تالاب کے گندے پانی میں ایک شخص اس لیے تیرتا ہے کہ اس سے نکلنے کے لیے اسی میں ہاتھ پاؤں مارے بغیر چارہ نہیں ہے اور دوسرا اس لیے تیرتا ہے کہ اسکا ایک جزو بنکر رہنا چاہتا ہے اور اسی کی شناوری میں عمر بسر کرنے پر راضی ہے۔ م

[2] عجیب اتفاق ہے کہ خان بہادر صاحب ٹھیک وہی سوال کر رہے ہیں جو فریسیوں نے اپنے شاگردوں کو بھیج کر مسیح علیہ السلام سے دریافت کرایا تھا۔ تَشَابَهَتْ قُلُوبُهُمْ کی اس سے بہتر تعبیر کیا ہوگی۔ میں خان بہادر صاحب کو اطمینان دلاتا ہوں کہ میرے جتھے میں جو لوگ بھی آرہے ہیں وہ کسی مغالطہ میں مبتلا نہیں ہیں۔ ساری باتیں وہ خوب سمجھ رہے ہیں۔ رہے باہر کھڑے ہو کر پوچھنے والے حضرات، تو انہیں جواب دینے پر میں مکلف نہیں ہوں۔ م

اوپر عرض کر چکا ہوں مولانا مودودی صاحب نے جو تفسیر آیۃ کریمہ:

"هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ" کی کی ہے وہ یہ ہے کہ "دین" کا لفظ اس آیۃ کریمہ میں قریب قریب وہی معنی رکھتا ہے جو زمانہ حال میں لفظ "اسٹیٹ" رکھتا ہے اور "دین حق" مولانا کے نزدیک یہ ہے کہ انسان دوسرے انسانوں کی، خود اپنے نفس کی، اور تمام مخلوقات کی بندگی اور اطاعت چھوڑ کر صرف اللہ کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرے اور اسی کی بندگی و اطاعت اختیار کرے پس درحقیقت اللہ کا رسول اپنے بھیجنے والے کی طرف سے ایک ایسے "اسٹیٹ" کا نظام لے کر آیا ہے جس میں نہ تو انسان کی خود اختیاری کے لیے کوئی جگہ ہے، نہ انسان پر انسان کی حاکمیت کے لیے کوئی مقام، بلکہ حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ جو کچھ بھی ہے صرف اللہ کے لیے - پھر رسول کے بھیجنے کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ وہ اس نظام اطاعت (دین) اور اس قانون حیات (الہدی) کو پوری جنس دین پر غالب کر دے - یہ رسول کا مشن ہے اور رسول اس مشن کو پورا کرنے پر مامور ہے - بالفاظ دیگر انبیاء اور ان کی بعثت کا مقصد دنیا میں ایک خاص قسم کا نظام حکومت قائم کرنا ہے - غالباً مولانا سے پیشتر مفسرین میں سے کسی نے خواہ وہ متقدمین میں سے ہوں یا متاخرین میں سے آیت کریمہ کی یہ تفسیر نہیں کی ہے - نہ انبیاء علیہم السلام کے عمل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنے مخاطبین اولین سے یہ مطالبہ کرتے ہوں کہ ہم ایک اسٹیٹ یا حکومت قائم کرنے آئے ہیں اور تم ہمکو ایک قسم کی اسٹیٹ قائم کر لینے دو۔[۱]

---

[۱] اس آیت کی تفسیر میں جو کچھ میں نے لکھا ہے اس کے سمجھنے میں بہت سے لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے اور اسکی وجہ یہ ہے کہ جب تک کسی شخص کی نظر جدید نظریۂ ریاست (Theory of State) پر نہ ہو اسکے لیے اس مضمون کا سمجھنا مشکل ہے - موجودہ زمانہ میں اسٹیٹ محض اس انتظامی مشینری کا نام نہیں ہے جو اندرونی نظم مملکت کا تحفظ اور بیرونی حملوں کی مدافعت کرتی ہے،

(بقیہ صفحہ ۱۲۵ پر)

مثلاً (۱) لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖ فَقَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ (سورۃ الاعراف رکوع ۸)

(۲) وَاِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ (سورۃ الاعراف رکوع ۹)

(۳) وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ (الاعراف رکوع ۱۰)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۴) بلکہ آج کل کا اسٹیٹ درحقیقت پوری انسانی زندگی کا ٹھیک اسی طرح احاطہ کرتا ہے جس طرح مذہب کرتا ہے۔ اشتراکی اسٹیٹ ہو یا فاشستی یا جمہوری، ہر ایک کی بنیاد میں ایک خاص مابعد الطبیعی نظریہ ہے، ایک خاص تصور کائنات ہے، ایک خاص تصور انسان ہے، ایک خاص فلسفۂ اخلاق اور ایک خاص اجتماعی فلسفہ ہے پھر ان میں سے ہر ایک اپنے مخصوص فلسفہ کے لحاظ سے ایک مقتدر اعلیٰ کا تعین کرتا ہے (مثلاً قوم یا باشندگان ملک یا کمیونٹی) جس کی نیابت و خلافت کسی ڈکٹیٹر، یا پارلیمنٹ یا پارٹی کے سپرد ہوتی ہے۔ پھر اسٹیٹ کے حدود میں رہنے والے تمام افراد سے اس مقتدر اعلیٰ کی حاکمیت تسلیم کرنے اور اس کی غیر محدود اطاعت کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ افراد کی زندگی اور بحیثیت مجموعی سوسائیٹی کی زندگی کا کوئی شعبہ اسٹیٹ کی گرفت سے باہر نہیں ہوتا۔ اسٹیٹ ہی اپنے نظریات کے مطابق انکی تعلیم اور تعمیر سیرت کا ذمہ لیتا ہے، اسٹیٹ ہی اپنے فلسفہ اخلاق کے مطابق ان کے لیے اخلاقی معیار مقرر کرتا ہے، اسٹیٹ ہی انکی زندگی کے لیے قوانین وضع کرتا ہے اور حلال و حرام کے حدود مقرر کرتا ہے، اور اسٹیٹ ہی یہ طے کرتا ہے کہ وہ اپنی سعی و جہد کن راہوں میں صرف کریں اور کن میں نہ کریں۔ اگرچہ اسٹیٹ کی یہی حقیقت ہر زمانہ میں تھی اور اسی بنا پر کہا گیا تھا کہ الناس علیٰ دین ملوکھم، مگر پہلے اس حقیقت پر پردہ پڑا ہوا تھا اور اب یہ بالکل کھل کر سامنے آگئی ہے اور تمام دنیا میں یہی نظریہ ریاست مسلم ہو چکا ہے۔ اب غور کیجیے کہ دین اس کے سوا اور کس چیز کا نام ہے؟ ایک مابعد الطبیعی عقیدہ، ایک مقتدر اعلیٰ کا تصور

(بقیہ صفحہ ۱۲۶ پر)

(۴) وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاھُمْ شُعَیْبًا قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ (الاعراف رکوع ۱۱)

(۵) الٓرٰ کِتٰبٌ اُحْکِمَتْ اٰیٰتُہٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَکِیْمٍ خَبِیْرٍ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اللّٰہَ اِنَّنِیْ لَکُمْ مِّنْہُ نَذِیْرٌ وَّبَشِیْرٌ (ہود - رکوع ۱)

ان آیات میں انبیاء کرام میں سے کسی نے اپنی قوم سے یہ نہیں کہا کہ ہم تمہارے درمیان اس واسطے آئے ہیں کہ تم میں ایک اسٹیٹ یا کوئی خاص قسم کا نظام حکومت قائم کریں۔ نہ اپنی قوم سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ ان کے مجوزہ نظام حکومت کو قبول کریں۔ جو کچھ بھی ان انبیاء علیہ السلام نے اپنی قوم سے مطالبہ کیا وہ صرف یہ تھا اعبدوا اللہ ما لکم من الٰہ غیرہ۔ ظاہر ہے!

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۵) جس سے بالاتر کوئی اقتدار (Authority) نہ ہو، اس مقتدر اعلیٰ کی حاکمیت تسلیم کرنا اور اپنے آپکو اسکی اطاعت میں دیدینا، ایک فلسفۂ اخلاق و فلسفۂ اجتماع (Social philosophy) جس پر زندگی کا پورا نظام قائم ہو، ایک ہمہ گیر قانون جو تمام معاملات زندگی کا احاطہ کرلے، انہی چیزوں کے مجموعہ کا نام تو دین ہے۔ اسی بنا پر خود آجکل کے مغربی فلاسفہ و مفکرین بھی یہ کہنے لگے ہیں کہ موجودہ دور کے اسٹیٹ نے خدا اور مذہب کی جگہ لے لی ہے۔ فرق اگر کچھ ہے تو صرف اس حیثیت سے ہے کہ جو شخص ان ریاستوں میں سے کسی کی اطاعت کرتا ہے اور اسی کی اطاعت کے برحق ہونیکا اعتقاد بھی رکھتا ہے وہ مومن بغیر اللہ و مسلم لغیر اللہ ہے، اور جو انکے برحق ہونیکا منکر اور اللہ کا معتقد ہے مگر انکی اطاعت پر راضی ہے وہ مومن باللہ و مسلم لغیر اللہ ہے۔ بخلاف اسکے انبیاء علیہم السلام جو دعوت لیکر آئے تھے وہ یہ تھی کہ لوگ مومن باللہ اور مسلم للہ ہو جائیں، اللہ ہی کو مقتدر اعلیٰ تسلیم کریں، اسی کی اطاعت قبول کریں اور انکی پوری زندگی پر وہی ہمہ گیر ضابطۂ اخلاقی و قانونی محیط ہو جو اللہ نے مقرر کیا ہے۔

اس چیز کو میں جن الفاظ میں بیان کرتا ہوں، بلاشبہ وہ متقدمین کے ہاں کہیں نہ ملینگے، کیونکہ اس وقت یہ الفاظ ان معانی کے ساتھ مستعمل نہ ہوتے تھے۔ مگر انصاف کے ساتھ دیکھیے کہ جس حقیقت کو میں بیان کر رہا ہوں، کیا وہی قرآن میں بیان نہیں ہوئی ہے اور کیا اسی کو تمام ائمۂ ھداۃ بیان نہیں کرتے چلے آرہے ہیں؟ - م

کہ ان انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں تھا کہ وہ خدا سے اُسکے بندوں کا رشتہ جوڑیں اور ماسوا سے ان کا رشتہ توڑیں[1] اور اُن سے یہ مطالبہ کریں:۔

کہ ہے ذاتِ واحد عبادت کے لائق ۔ زباں اور دل کی اطاعت کے لائق

لگاؤ تو لو اس سے اپنی لگاؤ ۔ جھکاؤ تو سر اس کے آگے جھکاؤ

بلکہ ذیل کی آیۃ یعنی قُلْ یٰاَیُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِیْ شَكٍّ مِّنْ دِیْنِیْ فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِیْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّیْنِ حَنِیْفًا (سورہ یونس رکوع ۱۱) سے

---

[1] افسوس یہ ہے کہ لوگ قرآن پڑھتے ہیں مگر سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ تمام انبیاء نے یہی کہا ہے کہ اللہ ہی کو الٰہ اور رب (یعنی ہر حیثیت سے مقتدر اعلیٰ) تسلیم کرو، اسی کی بندگی اختیار کرو اور جو ضابطۂ اخلاق و قانون (نظام شریعت) ہم اسکی طرف سے لیکر آئے ہیں اسی کی پیروی کرو۔ پچھلے نوٹ میں ہم نے اسٹیٹ کی جو تعریف بیان کی ہے اسکو سامنے رکھکر دیکھیے انبیاء علیہم السلام نے اللہ کے اقتدار اعلیٰ کا عقیدہ، انسان کی طرف سے اسکی تسلیم و اطاعت، اور انسانی زندگی پر شریعت الٰہی کے نفاذ کا مطالبہ جو پیش کیا تھا وہ ایک الٰہی اسٹیٹ یا حکومت الٰہیہ کے قیام کی دعوت کے سوا اور کیا تھا؟ اگر خان بہادر صاحب اسکے قائل نہیں ہیں تو وہ مجھے بتائیں کہ انبیاء آخر یہ شریعتیں لیکر کیوں آئے تھے؟ یہ حرام و حلال کے حدود کس لیے تھے؟ یہ دیوانی و فوجداری کے قوانین کیوں انہوں نے پیش کیے تھے؟ یہ مَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ، اور مَنْ یَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَیُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى، اور اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاهُ کا اعلان کیوں کیا جاتا تھا؟ اور ہر نبی یہ کیوں کہتا تھا کہ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ؟ کیا یہ شریعتیں اس حیثیت سے آئی تھیں کہ یہ بھی برحق ہوں اور انسانی ساخت کے قوانین بھی برحق ہوں اور انسان کے لیے یکساں جائز ہو کہ چاہے ان کی پیروی کرے اور چاہے اُن کی؟ — م

دین حق کی جو تفسیر مولانا نے کی ہے اسکی بداہتاً تردید ہوتی ہے[1] اس آیتہ میں دین کے معنی اگر "اسٹیٹ" کے لیے جاویں تو وہ کسی طرح کھپ نہیں سکتے - کلام پاک کا قاعدہ ہے کہ اسکی ایک آیت دوسرے کی تفسیر کرتی ہے - اس سے ثابت ہوا کہ "دین حق" کی جو تفسیر مولانا نے کی ہے وہ صحیح نہیں ہے - وہ انبیاء علیہم السلام تو جنکا ذکر آیات ۱ تا آیت ۴ میں ہوا ہے غالباً ایسی اقوام کی طرف مبعوث ہوئے تھے جن کا کوئی سربرآوردہ بادشاہ نہیں تھا - لیکن جن قوموں میں سربرآوردہ بادشاہ موجود تھے انکی طرف بھی جو انبیا مبعوث ہوئے انہوں نے بھی ان بادشاہوں سے یہ نہیں کہا تھا کہ تم اپنی گدی خالی کردو ہم تمہاری جگہ دوسرا انظام حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں[2] - چنانچہ وَقَالَ مُوسٰی یٰفِرْعَوْنُ اِنِّیْ رَسُوْلٌ

[1] تردید نہیں بلکہ انکی تائید ہوتی ہے - آیت کا ترجمہ مع تشریح یہ ہے :-

"(اے نبی) کہو کہ لوگو! اگر تم میرے دین کی طرف سے شک میں ہو (یعنی اگر تمہیں معلوم نہیں ہے کہ میں کس دین کا متبع ہوں) تو سن لو کہ) میں انکی بندگی نہیں کرتا جنکی تم اللہ کے سوا بندگی کرتے ہو، بلکہ میں اللہ کی بندگی کرتا ہوں جو تم کو وفات دیتا ہے (یعنی جسکے قبضۂ قدرت میں تم سب کی زندگی و موت ہے) اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں مومنوں میں سے ہوں (یعنی اسی اللہ پر ایمان لانے والوں میں سے ہو جاؤں) اور یہ کہ سب طرف سے منہ موڑ کر اپنا رُخ اسی الدّین (یعنی حقیقی و فطری دین) پر جما دے"!

پچھلے دونوں حاشیوں کو پیش نظر رکھ کر دیکھیے کہ جو کچھ میں نے کہا ہے یہ آیت اسکی تائید کر رہی ہے یا تردید - تمام خرابی اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ لوگوں نے عبادت کو محض پوجا اور پرستش کے معنی میں محدود کر دیا ہے اور اطاعتِ قانون کے مفہوم کو اس سے بالکل خارج سمجھ رکھا ہے اسی لیے وہ سمجھتے ہیں کہ بس اللہ کی پوجا کر لینے سے دین حق کا مدعا پورا ہو جاتا ہے، اور اسکے بعد اگر ساری زندگی غیر اللہ کے قانون کی اطاعت میں بسر ہو جائے تو اس سے دین میں کوئی رخنہ نہیں پڑتا - م

[2] آنکھ کھول کر قرآن نہ دیکھیے اور یہ چیز نہ ملے تو اس میں قصور آپ کا ہے یا کسی اور کا؟ کیا قرآن میں آپکو یہ آیت نہیں ملی کہ وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (ہم نے نہیں بھیجا کوئی رسول مگر اس لیے کہ اسکی اطاعت کی جائے اللہ کے اذن سے)؟ اور کیا آپ نے سورۂ شعراء نہیں پڑھی جس میں ہر نبی آکر یہی کہتا ہے کہ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ (پس تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو)؟ - م

مِّن رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ حَقِيْقٌ اَنْ لَّآ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (الاعراف رکوع ۱۳) اسی سورۃ الاعراف میں کئی رکوع تک موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا قصہ بیان کیا گیا ہے مگر اس دوران میں موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کا جو مقصد خاص مولانا مودودی صاحب کی تفسیر کے مطابق تھا یعنی ایک خاص نظام حکومت کا قیام اسکا کہیں ذکر تک نہیں آتا درآنحالیکہ اگر موسیٰ علیٰ نبینا علیہ السلام کی بعثت کا اصل منشا کسی خاص نظام حکومت کا قیام ہوتا تو سب سے پہلے اسی کی تبلیغ فرماتے[1]۔ اگر کسی نظام حکومت کا قیام انبیاء کی بعثت کا اصلی مقصد قرار دیا جائے

[1] حضرت موسیٰ کا واحد مشن صرف یہی نہ تھا کہ بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے چھڑائیں بلکہ یہ بھی تھا کہ فرعون کو اللہ کی اطاعت اور اذن الٰہی کے تحت اپنی اطاعت کی طرف دعوت دیں۔ چنانچہ ارشاد ہے:

اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا فَعَصٰى فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ فَاَخَذْنٰهُ اَخْذًا وَّبِيْلًا (المزمل - ۱)	ہم نے تمہاری طرف رسول بھیجا ہے جو تم پر شاہد ہے جس طرح ہم نے فرعون کی طرف رسول بھیجا تھا۔ پھر جب فرعون نے رسول کی نافرمانی کی تو ہم نے اس کو بڑی سختی کے ساتھ پکڑا۔
وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ وَجَآءَهُمْ رَسُوْلٌ كَرِيْمٌ اَنْ اَدُّوْٓا اِلَيَّ عِبَادَ اللّٰهِ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ وَّاَنْ لَّا تَعْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِنِّيْٓ اٰتِيْكُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ (الدخان - ۱)	ہم نے ان سے پہلے فرعون کی قوم کو آزمائش میں ڈالا تھا۔ انکے پاس ایک معزز رسول آیا اور اس نے کہا کہ اللہ کے بندوں کو میرے سپرد کرو میں تمہارے لیے امانت دار رسول ہوں، اور یہ کہ اللہ کے مقابلہ میں سر نہ اٹھاؤ میں تمہارے سامنے کھلی ہوئی حجت پیش کرتا ہوں۔

بعض لوگوں نے "اللہ کے بندوں کو میرے سپرد کرو" کا مطلب یہ لیا ہے کہ "بنی اسرائیل کو میرے سپرد کرو" حالانکہ الفاظ عام ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ ہم "اللہ کے بندوں" سے صرف بنی اسرائیل مراد لیں۔ اگر حضرت موسیٰ نے صرف بنی اسرائیل کی

(بقیہ صفحہ ۱۳۰ پر)

تو ماننا پڑیگا کہ انبیاء علیہم السلام میں سے اکثر تو اپنے مشن میں بالکل ہی ناکام رہے اور بعض اگر کامیاب بھی ہوئے تو محض جزوی[1]۔ سب سے پیشتر ابو الانبیاء سیدنا ابراہیم علیہ السلام ہی کو لے لیجئے۔ آپ اپنی صد سالہ زندگی کے دوران میں کوئی اسلامی حکومت قائم نہ فرما سکے۔ بلکہ کفار کے ظلم و جور سے مجبور ہوکر ایک مقام سے دوسرے مقام کو ہجرت ہی فرماتے رہے۔ عراق اور بابل کی سرزمین جب آپ پر تنگ ہوئی تو کنعان کی طرف ہجرت فرمائی اور وہاں سے حجاز کی سنگلاخ زمین کی طرف گئے جہاں

(بقیہ حاشیہ ص ۱۲۹) رہائی کا مطالبہ فرمایا تھا تو فرعون کو بار بار یہ خطرہ ظاہر کرنیکی کیا ضرورت تھی کہ:

اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰى (طٰہٰ ۳) اے موسیٰ کیا تم ہمیں ہماری زمین سے اپنے جادو کے بل پر نکالنے آئے ہو؟

کیوں وہ اپنی قوم کے لوگوں سے کہتا تھا کہ: اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِي الْاَرْضِ الْفَسَادَ (المومن - ۳) مجھے خوف ہے کہ یہ تمہارا دین بدل ڈالیگا یا زمین میں بدامنی پھیلا دیگا۔

اور کیوں اسکی قوم کے سردار کہتے تھے: اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى (طٰہٰ - ۳) یہ دونوں (موسیٰ و ہارون) تو جادوگر ہیں چاہتے ہیں کہ اپنے جادو کے بل پر تم کو تمہاری زمین سے بے دخل کردیں اور تمہارے طریقہ کو جو مثالی (آئیڈیل) ہے، ختم کردیں۔

اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ (یونس - ۸) کیا تو اسلئے آیا ہے کہ ہم کو اس طریقہ سے ہٹا دے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے اور یہ کہ زمین میں تم دونوں بھائیوں کی بڑائی ہو؟

یہ سب آیات اس بات پر شاہد ہیں کہ حضرت موسیٰ کی اولین دعوت سرزمین مصر کے نظام اطاعت کو تبدیل کرنیکی طرف تھی، اور جب اس دعوت کو رد کردیا گیا تو ان کا آخری مطالبہ یہ تھا کہ بنی اسرائیل کو اس سرزمین سے نکل جانے دیا جائے۔ م

[1] اگر انسانوں کا انبیاء کی دعوت کو قبول نہ کرنا انبیاء کی ناکامی ہے تو فی الواقع بہت سے انبیاء ناکام رہے۔ لیکن قرآن کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ دراصل انبیاء کی ناکامی نہیں ہے بلکہ ان نالائق انسانوں کی ناکامی ہے جنہوں نے اپنے خیرخواہوں کی دعوت نہ قبول کی اور اس راستہ کو نہ اختیار کیا جس میں خود ان کی فلاح تھی۔ م

آپ نے اور آپکے صاحبزادے سیدنا اسمٰعیل علیہ السلام نے خدا کے سب سے پہلے گھر کی بنیاد ڈالی - مگر وہاں بھی آپکی حیثیت کسی فاتح یا کسی منظم اسلامی حکومت کے ہیڈ یا سردار کی نہیں تھی بلکہ ایک مہاجر اور خدا کے پیغام کے مبلغ ہی کی تھی - وہاں بھی جو آپ دعا فرماتے ہیں وہ یہی ہے کہ اِنِّیْ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِکَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَۃً مِّنَ النَّاسِ تَھْوِیْ اِلَیْھِمْ وَارْزُقْھُمْ مِّنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّھُمْ یَشْکُرُوْنَ -

اگر آیۃ کریمہ کی اس تفسیر کو کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بعثت کا یہ مقصد تھا کہ وہ اسلامی حکومت کو جملہ غیر اسلامی حکومتوں پر غالب کر دیں صحیح مانا جائے تو ماننا پڑیگا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے مشن میں کامیاب نہیں ہوئے - اسی طرح سیدنا حضرت موسیٰ علیہ السلام اگرچہ بنی اسرائیل کو فرعون اور مصریوں کی غلامی سے آزاد کرانے میں کامیاب ہوئے لیکن وہ بنی اسرائیل کو چالیس سال تک فلسطین کے ریگستانوں میں لیے لیے پھرتے رہے اور وعدہ کی زمین یعنی بیت المقدس تک پہونچنے سے پیشتر انتقال فرما گئے اور کوئی معتد بہ اسلامی حکومت قائم نہیں کی - سیدنا مسیح علیہ السلام تو اس باب میں بالکل ہی ناکام رہے[1] -

ہمارے حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ضرور اپنے وصال سے پہلے عرب میں اسلامی حکومت

---

[1] ساری غلطی کامیابی و ناکامی کا مفہوم متعین کرنے ہی میں واقع ہو رہی ہے - اگر کوئی شخص شراب پی کر اپنی صحت اور اپنے اخلاق کو برباد کر رہا ہے اور میں خود اسکی بھلائی کے لیے اسے پرہیزگاری کی نصیحت کرتا ہوں اور وہ نہیں مانتا تو یہ میری ناکامی ہے یا اسکی؟ اگر آپ کہتے ہیں کہ تم سمجھانے میں ناکام ہوئے اسلیے یہ تمہاری ناکامی ہے تو میں مان لیتا ہوں کہ اس معنی میں میں ناکام رہا - مگر اس ناکامی سے آخر مجھ پر کیا حرف آیا؟ سمجھانے کا حق ادا کرنے میں میں نے کوتاہی کی ہو تو بے شک یہ میرا قصور ہوگا لیکن اگر میں نے پورا پورا حقِ نصیحت ادا کر دیا اور پھر اسکی اصلاح میں مجھے کامیابی نہ ہوئی تو ایسی ناکامی سے میرے اوپر کوئی الزام نہیں آتا، نہ یہ ناکامی میرے لیے باعثِ عار ہے - انبیاء علیہم السلام کی ناکامی اسی نوعیت کی ہے - م

قائم کرنے میں کامیاب ہوئے مگر اس حکومت کا اقتدار بھی حضور کے وصال تک جزیرۃ العرب سے باہر نہیں پھیلا تھا اس لیے حضور اقدس بھی مولانا مودودی کی تفسیر کے مطابق "دین حق" یا اسلامی حکومت یا خدا کی بادشاہت کو پوری جنس دین پر یا غیر مسلموں کی حکومتوں پر غالب کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے[۱]۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگرچہ حضور ایسا کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے مگر حضور کے بعد حضور کے خلفائے راشدین اور حضور کی امت ایسا کرنے میں کامیاب ہوئی مگر اول تو یہ واقعہ نہیں ہے دوسرے یہ کہ خداوند عالم اپنے کلام پاک میں فرما چکا ہے۔

"اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا"

جسکے معنی ہیں کہ دین حق حضور کی حیات ہی میں کامل ہو چکا[۲] اسلیے اسکی تکمیل جو حضور کے وصال کے بعد ہوئی ہو کوئی معنی نہیں رکھتی۔ نیز خلفائے راشدین کے زمانہ میں اگرچہ اسلامی حکومت ایشیاء اور افریقہ کے بہت بڑے حصہ میں پھیل گئی مگر پھر بھی یہ کہنا کہ وہ دنیا کی جملہ غیر مسلم حکومتوں پر غالب ہوگئی واقعہ کے خلاف ہے کیونکہ قریب قریب کل یورپ، افریقہ کا بڑا حصہ، چین، جاپان، ہندوستان، یہ سب ممالک اسکے حلقہ اثر سے باہر رہے۔ لیکن اگر آیۂ کریمہ کا یہ مطلب لیا جائے کہ حضور کی بعثت کا منشاء

---

[۱] جس طرح آپ استدلال فرما رہے ہیں اس طریقہ سے تو آپ دین کا جو معنی بھی متعین کریں گے اسی معنی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کو ناکام ثابت کیا جا سکتا ہے۔ اگر دین بمعنی مذہب یا دھرم لے لیا جائے تو کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں یا آپکے بعد دین اسلام کے سوا سارے دھرم مٹ گئے؟ اس وقت تک کفر کے پیرو اسلام کے پیرووں سے پانچ گنے زیادہ ہیں۔ پھر لیظھرہ علی الدین کلہ کے لحاظ سے تو آپ یہی کہیں گے ناکہ حضور جس کام کے لیے بھیجے گئے تھے وہ کام نہ آپ نے پورا کیا نہ آپ کی امت نے۔ دراصل یہ آپ کے طرز فکر کی غلطی ہے۔ آپ اپنا کامیابی و ناکامی کا معیار بدل دیں تو الجھن رفع ہو جائیگی۔ م

[۲] دین کی تکمیل کا مفہوم یہ ہے کہ دین حق کے جتنے پہلو ہیں، روحانی، اخلاقی، تہذیبی، تمدنی، سیاسی، قانونی، غرض سب علمی اور عملی دونوں حیثیتوں سے واضح ہو گئے۔ م

یہ تھا کہ خدا کا پیغام اسکے بندوں تک پہونچا دیا جاوے تو یہ مشن باحسن الوجوہ پورا ہوا اور اب بھی بعونہٖ تعالیٰ پورا ہو رہا ہے - اس وقت دُنیا کا کوئی گوشہ نہیں ہے خواہ چین ہو یا جاپان، روس ہو یا جرمنی، امریکہ ہو یا آسٹریلیا، ملایا، سماٹرا، جاوا ہو یا فلپائن، جہاں وہ پیغام جو نبی امی روحی فداہ آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے مکہ کی سنگلاخ زمین سے لیکر اٹھا تھا نہ پہونچ گیا ہو اور آجکل کے ترقی شدہ ذرائع رسل رسائل نے اس پیغام کی اشاعت کو اور بھی عام کر دیا ہے - یہ ضرور ہے کہ جب نبی کوئی پیغام لیکر آتا ہے اور اسکے مخاطبین اولین کا کوئی گروہ اس پیغام کو قبول کرتا ہے تو ان کو اپنی ایک حکومت قائم کرنیکی ضرورت پڑتی ہے اور وہ اپنی حکومت اسلامی طریقہ پر قائم کرتے ہیں، مگر اس حکومت کا قیام ایک ضمنی بات ہے، اس نبی کی بعثت کا اصلی مقصد نہیں ہے[1]۔

---

[1] کس قدر ڈھیلی ڈھالی گفتگو ہے جس میں قائل خود نہیں سوچتا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں - آخر نبی وہ کس قسم کا پیغام لاتا ہے جسکے قبول کرنے والوں کو اپنی حکومت ضرور قائم کرنی پڑتی ہے؟ اگر نبی کا پیغام صرف یہ ہے کہ اللہ کی پوجا کرو تو اس پیغام کے لیے اپنی حکومت قائم کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ پھر اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ وہ "حکومت اسلامی طریقہ پر قائم کرتے ہیں"۔ اگر نبی کوئی نظام حکومت قائم کرنے نہ آیا تھا، نہ اس نے کوئی نظام پیش کیا، نہ وہ نظام حکومت اس پیغام کا کوئی جزء تھا تو یہ "اسلامی طریقہ کی حکومت" کہاں سے آگئی؟ اور اگر ایک نظام حکومت بھی اس نے پیش کیا تھا اور وہ اس کے پیغام کا ایک جزء تھا تو اسکا قیام مقصدِ بعثت سے خارج اور ایک ضمنی چیز کیسے ہو گیا؟ کیا اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء کو جو پیغام دیتا ہے اس کا کوئی حصہ اختیاری (optional) بھی ہوتا ہے یا محض ضمیمہ کے طور پر ساتھ لگا دیا جاتا ہے کہ جی چاہے تو اسکے لیے کوشش کرے اور نہ چاہے تو نہ کرے؟ پھر اگر نبی کوئی نظام حکومت پیش کرتا ہے تو آیا اسکی حیثیت یہ ہوتی ہے کہ یہ نظام بھی برحق ہے اور اسکے خلاف کوئی دوسرا نظام ہو تو وہ بھی برحق ہے، یا اسکی یہ حیثیت ہوتی ہے کہ یہی ایک برحق نظام حکومت ہے اور اسکے خلاف جو نظام ہے وہ باطل ہے؟ اگر آپ پہلی بات کے قائل ہیں تو گویا آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ اسلام کی حکومت اور کفر کی حکومت دونوں یکساں ہیں اور اگر آپ دوسری بات کے قائل ہیں تو براہ کرم اچھی طرح غور کر کے بتائیے کہ حکومتِ اسلام اور حکومتِ کفر کے درمیان بنیادی

(بقیہ صفحہ ۱۳۴ پر)

"خدا کی بادشاہت زمین پر قائم کرنا" یہ ایک دوسرا نظریہ یا اصطلاح ہے جسکے ذریعہ سے مولانا مودودی صاحب مسلمان پبلک کو مسلمانوں کی موجودہ سیاسی جماعتوں کی طرف سے بدظن کرنا چاہتے ہیں۔ مگر یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ اس نظریہ یا اس اصطلاح کے لیے اسلامی لٹریچر سے مولانا نے کوئی سند پیش نہیں کی۔ زمین پر خدا کی بادشاہت والی اصطلاح اگر مولانا نے لی ہے تو اسی مغربی اور عیسائی لٹریچر سے لی ہے جسکی برائی کرنے سے مولانا مودودی صاحب کی زبان کبھی نہیں تھکتی۔ جس کسی کو بھی عیسائیوں کے مذہبی لٹریچر سے کچھ بھی واقفیت ہے وہ جانتا ہے کہ عیسائی دُنیا میں ذیل کی اصطلاحات عام طور پر رائج ہیں۔

۱- خدا کی بادشاہت آسمان پر۔   God's Kingdom in Heaven

۲- خدا کی بادشاہت زمین پر۔   God'S Kingdom on Earth

لہذا مولانا کی مندرجہ بالا اصطلاح عیسائیوں کی اصطلاح نمبر ۲ کا لفظی ترجمہ ہے۔ اگرچہ میرے خیال میں مولانا نے عیسائیوں کی اس اصطلاح کا مفہوم بھی غلط سمجھا ہے[۵] - یہ نظریہ کہ ہم

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۴) فرق کیا ہے اور ایک کے برحق اور دوسرے کے باطل ہونے کی اصولی توجیہ آپ کس طرح کرینگے؟ کاش خان بہادر صاحب نے ان باتوں پر غور کیا ہوتا تو انکی سمجھ میں خود یہ بات آجاتی کہ حکومت اسلامی کا بنیادی نظریہ اسلام کے عقیدۂ توحید و رسالت سے گہرا تعلق رکھتا ہے اور یہ چیز ضمنی نہیں ہے بلکہ اساسی اہمیت رکھتی ہے۔ لا الٰہ کی نفی میں ہی حاکمیت غیر اللہ کا انکار اور الا اللہ کے اثبات ہی میں حاکمیت اللہ کا اقرار شامل ہے اور یہ بنیاد ہے اسلامی حکومت کی۔ م

۵ خان بہادر صاحب نے ان چند سطروں میں غلط فہمیوں کا ایک جنگل پیش کیا ہے وہ پہلے تو "مغربی" اور "مسیحی" کو ایک چیز قرار دے لیتے ہیں پھر یہ فرض کرتے ہیں کہ میں نے جتنی مخالفت مغربیت کی کی ہے وہ دراصل مسیحیت کی مخالفت ہے، پھر یہ قیاس قائم کرتے ہیں کہ وہ "زمین پر خدا کی بادشاہت" جس کا ذکر مسیحی لٹریچر میں آیا ہے وہ ایک غلط چیز ہے کیونکہ وہ مسیحی لٹریچر میں آیا ہے، پھر اہل مغرب نے ان الفاظ کا جو مفہوم متعین کیا ہے اسکو صحیح تسلیم کر کے مجھے الزام دیتے ہیں کہ تو نے ان الفاظ کا مطلب غلط سمجھا (بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۵ پر)

زمین پر خدا کی بادشاہت یا حکومت الٰہیہ قائم کرنے کے لیے مامور ہیں دو باتوں کو مستلزم ہے[لہ]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۴) حالانکہ یہ سب آنجناب کی اپنی غلط فہمیاں ہیں۔ مغربی اور مسیحی دونوں ایک چیز نہیں ہیں، دو مختلف چیزیں ہیں۔ میں نے جتنی نکتہ چینی مغربیت پر کی ہے وہ ساری کی ساری آپ سے آپ مسیحیت پر چسپاں نہیں ہو جاتی۔ مسیحیت کے لٹریچر میں کسی چیز کا پایا جانا اس چیز کے غلط ہونے کو ہرگز مستلزم نہیں ہے۔ مسیحی مذہب بہرحال ایک پیغمبر جلیل القدر کی تعلیم سے ماخوذ ہے۔ اس میں خواہ کتنی ہی تحریف ہوئی ہو، مگر پھر بھی کچھ چیزیں اصلی بھی موجود ہیں، اور اگر وہ قرآن کے مطابق ہوں تو ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ سیدنا مسیح نے ہی ان باتوں کی تعلیم دی ہوگی۔ یہ "خدا کی بادشاہت" کا جو مفہوم اہلِ مغرب نے سمجھا ہے دراصل وہی غلط ہے کیونکہ وہ اس سے مراد آسمانی بادشاہت لیتے ہیں، اور میں جو مفہوم لے رہا ہوں وہ صحیح ہے کیونکہ مسیح خود فرماتے ہیں: "تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی ہو۔" اس سلسلہ میں اگر کوئی شخص میری کتاب مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم کا آخری حصہ پڑھ لے تو کوئی غلط فہمی باقی نہ رہے۔

اب رہا یہ سوال کہ "زمین پر خدا کی بادشاہت" کا تخیل اسلامی ہے یا غیر اسلامی تو اس پر کسی لمبی چوڑی بحث کی یہاں ضرورت نہیں۔ خان بہادر صاحب نے آگے چل کر خود تسلیم کیا ہے کہ اسلام خلافت الٰہیہ کا نظریہ پیش کرتا ہے اور وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ مسلم حکمراں کی حیثیت خلیفہ کی ہے۔ اس کے بعد صرف سمجھ کا پھیر باقی رہ جاتا ہے، ورنہ بات بغیر کسی دقت کے سمجھی جا سکتی ہے۔ جب مسلم حکمراں خلیفہ یعنی نائب ہے تو وہ بادشاہ کون ہے جس کی وہ نیابت کر رہا ہے؟ خدا یا کوئی اور؟ اگر ہم زمین میں خلافت قائم کریں گے تو بادشاہت کس کی ہوگی؟ خدا کی یا کسی اور کی؟ - م

لہ اس مقام سے لے کر آئندہ کئی صفحوں تک خان بہادر صاحب نے جو بحث فرمائی ہے وہ ساری کی ساری ایک عظیم الشان غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ محض امر تکوینی اور امر تشریعی کا فرق نہ سمجھنے کی وجہ سے وہ اس بھول بھلیاں میں پڑ گئے ہیں، اور مصیبت یہ ہے کہ وہ مطالعہ و تحقیق کے بغیر اس قسم کے مسائل پر قلم اٹھانے کی جرأت کرتے ہیں۔ میں نے رسالہ دینیات کے پہلے باب میں اور اپنے مضمون "سلامتی کا راستہ یہی" اور اسی سال ماہ ربیع الاول کے اشارات میں اس مسئلہ کو پوری طرح واضح کر دیا ہے اور دستور جماعت اسلامی میں تو اس کی اتنی توضیح کر دی گئی ہے کہ کسی شک کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔ - م

(۱) اول یہ کہ پہلے سے زمین پر خدا کی بادشاہت یا حکومت قائم نہ ہو جب ہی تو ہم اس کو قائم کرینگے۔

(۲) دوئم یہ کہ ہم خدا کی یہ حکومت اپنے سوا کسی دوسری مخلوق پر قائم کریں مثلاً ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان میں آئی اور اس نے برٹش کراؤن کی حکومت ہندوستان پر قائم کی۔ ظاہر ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایسا کرنے سے پیشتر برٹش کراؤن کی حکومت ہندوستان پر قائم نہیں تھی نیز یہ کہ وہ حکومت ہم ہندوستانیوں پر قائم کی گئی جو برٹش کراؤن اور ایسٹ انڈیا کمپنی دونوں سے جدا تھے۔

لیکن کیا یہ واقعہ ہے کہ بحر و بر زمین و آسمان سورج چاند تارے یا اس عالم شہود میں کوئی بھی ایسی چیز ہے یا ہو سکتی ہے جو خداوند ذوالجلال کی حکومت اور بادشاہت سے باہر ہو؟ اس عالم وجود میں جو کچھ بھی ہے آب و آتش، شجر و حجر، زمین و آسمان وہ سب طوعاً و کرہاً اس قادر مطلق کی حکومت کو مانتے ہیں اور اسکے سامنے سر بسجود ہیں۔

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ۔ (النحل۔ رکوع ۶)

ونیز وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ طَوْعًا وَّكَرْهًا الخ (سورہ الرعد رکوع ۲)

یہ خیال کہ ہم انسان خدا کی حکومت اس زمین پر قائم کر سکتے ہیں در اصل شرک فی القدرت کے مترادف ہوگا جو در اصل کفر ہے۔ اور پھر ہم خدا کی حکومت قائم کرینگے تو کس پر؟ (۱) شجر پر یا حجر پر؟ آب پر یا باد پر؟ برق پر یا رعد پر؟ (۲) یا خود اپنے اوپر؟ اول الذکر تو خود پہلے ہی سے اس کے مطیع و منقاد ہیں پھر ہم ان پر حکومت اللہ کیا قائم کرینگے۔ ان سب چیزوں کو تو پہلے ہی سے خداوند عالم نے ہمارے لیے مسخر کر رکھا ہے، جب ہی تو ہم ان سے فائدہ اٹھا سکے ہیں اور اٹھاتے ہیں۔

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرماں بردار — شرطِ انصاف نباشد کہ تو فرماں نہ بری

اگر ان فطرت کی قوتوں کو خداوندِ عالم نے ہمارے وجود میں آنے سے پیشتر ہی ہمارے لیے مسخر نہ فرما دیا ہوتا تو ہمارا اس عالمِ آب و گل میں ایک دم کے لیے زندہ رہنا محال ہو جاتا۔ رہا خود اپنے اوپر حکومتِ الٰہیہ قائم کرنا تو وہ بھی پہلے ہی سے قائم و ثابت ہے۔ ہمارا مرنا جینا یہاں تک کہ سانس لینا ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ جو سانس کہ باہر آتی ہے وہ مفرح ذات ہے اور جو اندر جاتی ہے وہ ممدِ حیات۔ مگر اس سانس کا اندر جانا اور باہر آنا یہ سب ہمارے اختیار سے باہر ہے ہم غذا کھاتے ہیں۔ پانی پیتے ہیں۔ یہ غذا جزو بدن بنکر خون صالح پیدا کرتی ہے جس سے ہماری زندگی قائم رہتی ہے۔ مگر غذا کا معدہ میں جاکر ہضم ہونا اور اس سے خون صالح کا پیدا ہونا یہ سب بغیر ہمارے ارادہ اور اختیار کے ہوتا رہتا ہے۔

لہٰذا حکومت الٰہیہ تو زمین و آسمان پر پہلے ہی سے قائم اور دائم ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو عالم کا یہ سب کارخانہ ایک لحمہ میں درہم برہم ہو جائے۔ ایسی حالت میں ہمارا زمین پر حکومت الٰہیہ قائم کرنا بالکل بے معنی ہے۔

دراصل اسلامی نظریہ یہ نہیں ہے کہ ہم زمین پر حکومت الٰہیہ قائم کرنے آئے ہیں اور انبیاء علیہم السلام اسی لیے مبعوث ہوئے تھے بلکہ اسلامی نظریہ یہ ہے کہ ہم زمین پر خلیفۃ اللہ ہیں اور ہم اس بات کے لیے مامور ہیں کہ ہم خود اپنے درمیان اور تمام دوسری مخلوق کے ساتھ جو اس زمین پر موجود ہے ایسا عمل اور برتاؤ کریں جو خلیفۃ اللہ کے لیے سزاوار ہے۔ اور انبیاء علیہم السلام اگر مبعوث ہوئے تو صرف اسلیے کہ ہمکو یاد دلائیں کہ ہم خلیفۃ اللہ ہیں اور ہمکو خلیفۃ اللہ کے شایان عمل اور برتاؤ کرنیکے ضروری اصول سکھا دیں اور ان اصول کا برتنا اور ان سے فروع کا استنباط خود ہماری عقل اور وجدانِ صحیح پر چھوڑ دیں۔ اسی ہماری عقل اور ہمارے ذاتی علم کی بناء پر جسکے حصول کے لیے

ہم مامور ہیں) خداوند عالم نے ہم کو اپنا خلیفہ اور مسجود ملائکہ بنایا اور اسی کی بنا پر ہم جزا اور سزا کے مستوجب بنے۔ چنانچہ ارشادِ خداوندی ہے وَ اِذۡ قَالَ رَبُّکَ لِلۡمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیۡ جَاعِلٌ فِی الۡاَرۡضِ خَلِیۡفَۃً ؕ قَالُوۡۤا اَتَجۡعَلُ فِیۡہَا مَنۡ یُّفۡسِدُ فِیۡہَا وَ یَسۡفِکُ الدِّمَآءَ ۚ وَ نَحۡنُ نُسَبِّحُ بِحَمۡدِکَ وَ نُقَدِّسُ لَکَ ؕ قَالَ اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ۝ وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ کُلَّہَا ثُمَّ عَرَضَہُمۡ عَلَی الۡمَلٰٓئِکَۃِ ۙ فَقَالَ اَنۡۢبِـُٔوۡنِیۡ بِاَسۡمَآءِ ہٰۤؤُلَآءِ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ۝ قَالُوۡا سُبۡحٰنَکَ لَا عِلۡمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمۡتَنَا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ الۡعَلِیۡمُ الۡحَکِیۡمُ ۝ قَالَ یٰۤاٰدَمُ اَنۡۢبِئۡہُمۡ بِاَسۡمَآئِہِمۡ ۚ فَلَمَّاۤ اَنۡۢبَاَہُمۡ بِاَسۡمَآئِہِمۡ ۙ قَالَ اَلَمۡ اَقُلۡ لَّکُمۡ اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ غَیۡبَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ۙ وَ اَعۡلَمُ مَا تُبۡدُوۡنَ وَ مَا کُنۡتُمۡ تَکۡتُمُوۡنَ ۝ وَ اِذۡ قُلۡنَا لِلۡمَلٰٓئِکَۃِ اسۡجُدُوۡا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوۡۤا اِلَّاۤ اِبۡلِیۡسَ ؕ
(سورہ بقرہ۔ رکوع ۴)

کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

جب ہم اپنے اس خلیفۃ اللہ والے پوزیشن (   ) یا مرتبہ سے گر جاتے ہیں اور ہم میں خصائل رذیلہ پیدا ہو جاتے ہیں اس وقت انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوتے ہیں تاکہ ہم کو ہماری ذلت کی حالت سے نکال کر پھر اوجِ رفعت پر پہونچا دیں۔ ہماری فرشتوں پر برتری کی اگر کوئی وجہ تھی تو صرف یہی کہ ہمکو حقائق اشیاء کے علم سے سرفراز فرمایا گیا تھا جو فرشتوں کو بھی حاصل نہیں تھا۔ اب اگر ہماری ذلت کی کوئی وجہ ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ ہم نے مظاہرِ قدرت کا علم حاصل کرنا اور فطرت کی قوتوں پر قابو پانا جسکے لیے ہم خداوند عالم کی طرف سے مامور تھے اور جسکی بنا پر ہمکو خلافت ملی تھی اور مسجود ملائکہ بنے تھے چھوڑ دیا۔ خدا کی آیات بینات جو عالم میں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں ان پر غور کرنا

اور خدا کے کلام میں تدبر اور تفقہ کرنا چھوڑ دیا - اور تقلید جامد کو اپنا شیوہ بنا کر ارباباً من دون اللہ کی پرستش شروع کر دی تو لازمی نتیجہ ہوا کہ ہم اس علم سے محروم ہو گئے جو ہماری وجہ امتیاز تھا - لہٰذا ہم اپنے منصب جلیلہ سے گرا دیے گئے -

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا جو میں کہہ رہا تھا وہ یہ تھا کہ ہم اسکے لیے مامور نہیں ہیں کہ زمین پر خدا کی بادشاہت قائم کریں (وہ تو قائم اور دائم ہی ہے خواہ کوئی اپنی کج فہمی سے سمجھے یا نہ سمجھے) بلکہ ہم اس دنیا میں خلافت الٰہیہ قائم کرنے آئے ہیں اور اس پر مامور ہیں کہ اس کو اس طریقہ پر قائم کریں جو ایک خلیفۃ اللہ کے سزاوار ہو - اور وہ خلیفۃ اللہ اس خلافت کو ان ضروری اصولوں کی روشنی میں جو اسکو انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ سے پہونچے ہیں خود قائم کریگا اور وہ خلافت خواہ شاہنشاہیت کی صورت میں ہو یا ڈکٹیٹر شپ کی صورت میں یا جمہوریت کی صورت میں وہ اسی خلیفۃ اللہ کی حکومت ہوگی[1] - اور اسی وجہ سے یہ خلیفۃ اللہ مستوجب جزا و سزا کا ہوگا کہ آیا اس نے یہ حکومت حق کی بنیادوں

[1] آخر اس کلام بلا فکر کی کوئی حد بھی ہے "خلافت الٰہیہ" کا لفظ خود بول رہے ہیں اور پھر نہیں سمجھتے کہ اسی لفظ میں خدا کی بادشاہت کا مفہوم موجود ہے - پھر خود ہی پہلے کہہ چکے ہیں کہ کوئی نظام حکومت قائم کرنا انبیاء کے مشن میں شامل نہ تھا اور اب یہاں ارشاد ہو رہا ہے کہ ہم خلافت الٰہیہ قائم کرنے پر "مامور" ہیں - اسکے بعد سب سے زیادہ عجیب بات یہ ارشاد ہوتی ہے کہ "خلافت خواہ شہنشاہیت کی صورت میں ہو یا ڈکٹیٹر شپ کی صورت میں یا جمہوریت کی صورت میں وہ اسی خلیفۃ اللہ کی حکومت ہوگی" معلوم ہوا کہ حضرت خلافت کے لغوی معنی تک سے ناواقف ہیں کجا کہ قرآنی اصطلاح ہونے کی حیثیت سے اسکی روح کو سمجھیں - انکو معلوم نہیں کہ خلیفہ کہتے ہی اسکو ہیں جو خود مالک نہ ہو بلکہ مالک کی طرف سے اسکے نائب کی حیثیت میں کام کرے، اور اس مفہوم کے لحاظ سے خلافت صرف اس حکومت کو کہہ سکتے ہیں جو اس واضح تصور پر قائم ہو کہ مالک الملک، شہنشاہ اور آمر اللہ ہے اور حکومت کا نظام چلانے والے لوگ صرف اسکا امر شرعی نافذ کرنے والے ایجنٹ ہیں، اور انہیں اصل مالک کو اس امانت کا حساب دینا ہے - پھر بھلا اس سے زیادہ مہمل اور

(بقیہ صفحہ ۱۴۰ پر)

پر قائم کی یا باطل کی بنیادوں پر۔ دیکھنا ہوگا کہ اس خلیفۃ اللہ کی اس حکومت میں فرمانِ خداوندی ۔ ان اللہ یامرکم بالعدل والاحسان و ایتاءِ ذی القربیٰ وینھیٰ عن الفحشاءِ والمنکر والبغی یعظکم لعلکم تذکرون (سورۃ نحل رکوع - ۱۲) کی کہانتک تعمیل ہوتی ہے - اور اسی جامع و مانع معیار سے جو اس آیۃ کریمہ میں مذکور ہے (اور غالباً اسی بناء پر آیۃ کریمہ کو خلیفہ راشد حضرت عمر ابن عبد العزیز رضی اللہ عنہ نے خطبہ جمعہ کے آخر میں درج فرمایا) دیکھنا ہوگا کہ جو حکومتیں اس خلیفۃ اللہ نے مختلف زمانوں میں قائم کیں وہ کہانتک اس معیار پر پوری اترتی ہیں - انسان کی قائم کردہ حکومتوں کی بابت خواہ وہ زمانہ سابق کی ہوں خواہ زمانہ حال کی خواہ وہ جمہوری ہوں یا شاہنشاہی یہ کہنا کہ وہ بالکل طاغوت کی حکومتیں ہیں جیسا کہ مودودی صاحب کا دعویٰ معلوم ہوتا ہے کسی طرح صحیح نہیں ہے[1] - ضرورت ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۹) کیا بات ہوگی کہ خلافت کیلئے جمہوریت اور ڈکٹیٹرشپ اور شہنشاہیت سب کو بطور ایک قالب کے تجویز کیا جائے درانحالیکہ یہ تینوں چیزیں اپنی روح، اپنے بنیادی اصول، حتیٰ کہ اپنے لفظی مفہوم تک کے اعتبار سے خلافت سے بالکل مختلف نوعیت کی چیزیں ہیں - میں نے اپنے مضمون "اسلام کا نظریۂ سیاسی" میں اس مسئلہ کو پوری وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ م

[1] اوپر سے خان بہادر صاحب خلیفۃ اللہ کا لفظ برابر انسان کے معنی میں استعمال کرتے چلے آرہے ہیں اور خلافت انسانی کے مختلف مراتب کے درمیان فرق و امتیاز کا کوئی لحاظ انہوں نے نہیں کیا ہے - اسی کا نتیجہ ہے کہ یہاں پہنچ کر پھر انہوں نے ایک زبردست ٹھوکر کھائی - بلاشبہ انسان کا پیدائشی منصب خلیفہ ہی کا ہے، لیکن آگے چل کر تمام انسان دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں - ایک وہ جو خلیفہ ہونے کی حیثیت سے اپنے منصب کو سمجھیں، مالک کی طرف سے جو حکم شرعی انکی طرف بھیجا گیا ہو اس کے ماتحت ہو کر کام کریں، اور خلافت کی حد سے گذر کر خود مالک ہونے کے زعم میں مبتلا نہ ہوں - دوسرے وہ جو خلیفہ کی حیثیت سے کام کرنے کے بجائے خود مختار بن بیٹھیں اور اصل مالک کے حکم شرعی کو تسلیم کرنے کے بجائے خود اپنی شریعت جاری کریں - اصطلاحاً لفظ خلیفہ کا اطلاق صرف پہلے گروہ پر ہو سکتا ہے - رہا دوسرا گروہ تو وہ مقرر تو کیا گیا تھا خلیفہ ہی کی حیثیت سے مگر اب وہ باغی ہو گیا، اسکے "بالکل طاغوت" ہونے میں کوئی کسر باقی نہیں رہی، اور اب اسکے کسی کام کو خلیفہ کا کام نہیں کہا جا سکتا - خان بہادر صاحب اس پوزیشن کو یوں اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ جب وہ سلطنت برطانیہ کے کسی
(بقیہ صفحہ ۱۴۱ پر)

کہ ان سب حکومتوں کو معیار مندرجہ بالا پر جانچا جاوے - جہاں تک وہ اس معیار کو پورا کرتی ہیں، جہاں تک ان میں عدل ہے، احسان ہے، ایتاء ذی القربیٰ پر عمل ہے، اور فحشاء و منکر اور بغی سے اجتناب ہے، وہاں تک وہ حق کی حکومتیں ہیں اور جہاں تک وہ اس معیار سے گری ہوئی ہیں اسی حد تک ان میں طاغوت کو دخل ہے[1]۔ نیز یہ کہ خداوند عالم نے انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ سے اس خلیفۃ اللہ کو جو پیغام بھیجے اور اصولِ دین سکھائے اسکا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ خلیفۃ اللہ اپنی عقل

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۰) ضلع میں کلکٹر (یعنی خلیفہ برطانیہ) کی حیثیت سے کام کرتے تھے اُس وقت اگر وہ اپنے ضلع کی بادشاہی کا دعویٰ کر دیتے، یا ضلع کے باشندوں کی جمہوریت قائم کر کے خود صدر بن جاتے، اور انگریزی قانون کو رد کر کے اپنا یا ضلع کی پارلیمنٹ کا بنایا ہوا قانون جاری کر دیتے، اور ہندوستان میں تاج کی طرف سے جو افسر اُسکے مامور ہے اسکی ماتحتی قبول کرنے سے انکار کر دیتے تو اس صورت میں انکی حیثیت کلکٹر ہی کی باقی رہ جاتی یا یہ طرز عمل اختیار کرتے ہی وہ باغی و طاغی قرار پاتے؟ پھر جو خلیفۃ اللہ اپنے رب کے مقابلہ میں بعینہ یہی طرز عمل اختیار کرے، وہ کس طرح بدستور خلیفہ باقی رہ سکتا ہے اور اسکے طاغوت ہونے میں خان بہادر صاحب کو کیوں شک ہے؟ حقیقت میں اب وہ خلیفہ نہیں رہا بلکہ اب تو محض رب العالمین کے حلم و بردباری کے صدقہ میں اسے مہلت ملی ہوئی ہے۔ رب العالمین کے ملک میں اس باغی کے تمام تصرفات اب صرف اس وجہ سے ممکن ہو رہے ہیں کہ اسے ڈھیل دی جا رہی ہے، لَعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَىٰ - جونہی کہ یہ مہلت کی مدت پوری ہوئی، یکایک امرِ الٰہی کے تحت تمام عناصر کائنات نہیں محض کوئی ایک عنصر ہی اِن باغی خلیفہ صاحب کیلیے مسخر ہونے سے انکار کر دیگا اور یہ اس طرح صفحۂ ہستی سے مٹینگے کہ نام و نشان تک باقی نہ رہیگا۔ م

[1] یہ سراسر غلط بات ہے۔ تاج برطانیہ کے خلاف اگر آپ بغاوت کر کے اپنی آزاد حکومت قائم کر لیتے تو کیا سلطنت برطانیہ آپکے کاموں کو اس حیثیت سے جانچتی کہ آپکے کون سے کام برٹش لاء کے اصولوں کے مطابق ہیں اور کون سے اسکے خلاف؟ پھر آخر اللہ کے باغیوں کی حکومتوں کو آپ انکے کاموں کی تفصیلات کے لحاظ سے کہاں جانچنے چلے ہیں۔ باغی کا تو پورا کارخانہ بغاوت ہی بغاوت ہے۔ اس میں عدل و احسان کی تلاش کے کیا معنی؟ اسکا تو پورا کام ہی فحشاء و منکر و بغی ہو گیا۔ اب اس میں جزئی حیثیت سے یہ امتیاز نہیں ہو سکتا کہ اسکے فلاں حصے فحشاء و منکر و بغی ہیں اور فلاں نہیں ہیں۔ م

اور سمجھ سے کام لینا چھوڑ دے اور اپنے سب قوائے ذہنی کو معطل کر کے بیٹھ جائے۔ مثلاً آیۂ کریمہ متذکرہ بالا میں خداوند عالم کی طرف سے عدل و احسان و ایتاء ذی القربیٰ کا حکم دیا گیا اور منکر وغیرہ سے نہی فرمائی گئی ہے۔ مگر عدل، احسان ایتاء ذی القربیٰ کی کوئی تعریف نہیں کی گئی، نہ فحشاء منکر و بغی کی کی گئی۔ لہٰذا عدل کیا چیز ہے، احسان کیا چیز ہے، منکر کس کو کہتے ہیں، بغی کس کو کہتے ہیں، یہ سب باتیں خلیفۃ اللہ کی اپنی عقل و سمجھ پر چھوڑ دی گئیں کہ وہ اپنی عقل و سمجھ کے ذریعہ سے انکی تعیین کرے[1]

اسی طرح اس خلیفۃ اللہ کو حکم ہوا کہ الامر شوریٰ بینکم۔ یہ اصول تو بتا دیا گیا مگر اس کی تصریح نہیں کی گئی کہ شوریٰ تم کس طرح کرو۔ شوریٰ کے ذریعہ سے جو حکومت تم قائم کرو وہ کیسے قائم کرو۔ وہ جمہوری ہو یا طبقاتی۔ ڈکٹیٹر شپ ہو یا شاہنشاہیت۔ یہ سب باتیں اسی خلیفہ کی رائے پر چھوڑ دیں[2] ورنہ اگر جملہ جزئیات کا ہر ہر شعبۂ زندگی کی بابت احصار شرع میں کر دیا جاتا تو اول تو لا متناہی طومار بن جاتا، دوسرے

---

[1] نعوذ باللہ من ذالک، اس سے بڑھ کر خلاف واقعہ بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ جو شخص قرآن و حدیث پر نظر رکھتا ہو کیا وہ کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی اس غلط بیانی کو قبول کر سکتا ہے؟ اللہ اور اسکے رسول نے صرف یہی نہیں کہ ان تمام چیزوں کی حقیقت بالکل غیر مشکوک طور پر واضح کی ہے بلکہ ان میں سے ہر ایک کے متعلق جزئی احکام تک دیئے ہیں، ہر ایک کی متعین عملی صورتیں بتائی ہیں، ایسی اصولی ہدایتیں دی ہیں جو غیر مصرح جزئیات میں بھی عدل یا احسان یا فحشاء و منکر کے وجوہ کا تعیّن کرنے میں ہماری پوری رہنمائی کرتی ہیں۔ چند مبہم الفاظ میں ایک حکم دے کر ہم کو تاریکی میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ نہیں دیا گیا ہے کہ مغربی فلاسفۂ اخلاق و قانون کی طرح منکر اور معروف، عدل و احسان اور ظلم و بغی کے تعین میں اٹکل پچو حکم لگاتے رہیں۔ م

[2] ہرگز نہیں۔ اگر آپ کو معلوم ہوتا کہ جمہوری، طبقاتی، ڈکٹیٹر شپ، اور شاہنشاہیت کے مفہومات کیا ہیں اور قرآن و حدیث پر بھی آپ کی نظر ہوتی تو آپ جان لیتے کہ اللہ اور اسکے رسول نے ان میں سے ہر ایک کی نفی کی ہے اور ان سب سے الگ خلافت کے بنیادی اصول پوری طرح بتا دیئے ہیں۔ نیز رسول اکرم اور آپ کے تربیت یافتہ ساتھیوں نے نظام خلافت کو عملاً چلا کر بتا دیا جس سے خلافت کی اسپرٹ اور طریق کار دونوں ہمیشہ کے لیے دوسرے تمام نظامات حکومت سے ممیز ہو گئے ہیں۔ م

یہ کہ پھر انسانی ذہن اور عقل معطل ہو کر رہ جاتیں جو یقیناً شارع اسلام کی منشا کے خلاف ہے۔[1]

اوپر کی سطور میں مولانا مودودی صاحب کے صرف دو نظریوں سے یعنی مولانا کی دینِ حق کی تعبیر اور زمین پر خدا کی بادشاہت کا قیام والے نظریوں سے بحث کی گئی ہے۔ مولانا کے باقی نظریوں سے بحث کرنا میں اس سیاسی بحث میں بالکل غیر ضروری سمجھتا ہوں۔ اگرچہ ان دونوں نظریوں کی بحث بھی موجودہ سیاسی کشمکش کی بحث میں بالکل غیر متعلق تھی۔ لیکن چونکہ مولانا نے ان مباحث کو چھیڑ کر مسلمانوں کو ملک کی سیاسی جماعتوں سے بدظن کرنا چاہا تھا اس لیے مولانا کے ان دونوں نظریات کی بابت کچھ نہ کچھ کہنا ناگزیر تھا۔[2]

اب جو کچھ عرض کرنا مجھکو رہ گیا ہے وہ یہ ہے کہ ہندوستان میں آئندہ جو کچھ نظام حکومت بھی بنے اس میں مسلمانوں کا تعلق غیر مسلموں سے کیا ہوگا اور وہ اسلامی نقطۂ نظر سے کہاں تک جائز یا ناجائز ہوگا۔ کانگریس جماعت کے جو علماء یا مسلمان ہیں وہ تو آئندہ کے لیے ایسے نظام حکومت پر راضی ہیں جس میں صوبجات کی

[1] خدا اور رسول نے نہ تو انسانی ذہن و عقل کو بالکل معطل کیا ہے اور نہ اندھے بھینسے کی طرح تاریکی میں بھٹکتے پھرنے کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ آپکو تو صرف جمود و تعطل سے بچنے کی فکر ہے، مگر اسلام جتنا اس سے بچانا چاہتا ہے اتنا ہی عقل کی بے راہ رویوں سے بھی بچانا چاہتا ہے۔ م

[2] اسلام کے ان مہمات مسائل کو سمجھنے میں آپ نے جو ٹھوکریں کھائی ہیں اور ابھی کچھ مدت پہلے مسلم لیگ کے سرکاری اخبار نے انہی امور پر جو بے سروپا رائے زنی کی ہے اسکو دیکھتے ہوئے تو فی الواقع آپ لوگ بدظنی ہی کے مستحق ہیں۔ جس گروہ کی آپ اور ایڈیٹر منشور نمائندگی کر رہے ہیں اسکے اکابر زعماء اور اسکے عام کارکنوں کا علم و فہم اسلام کے متعلق آپ دونوں حضرات سے بھی کم ہے، اور اس پر خوفِ خدا اور احساس ذمہ داری کی کمی کا یہ حال ہے کہ بہ نہایت جرأت کے ساتھ اس گروہ کا ہر شخص اسلام کی طرف جو چاہتا ہے کہتا ہے اور جو چاہتا ہے منسوب کرتا ہے۔ نہ جاننا اتنا بڑا عیب نہیں جتنا یہ ہے کہ آدمی نہ جاننے کے باوجود اپنے آپکو جاننے والا سمجھے اور ناقص معلومات کی بنیاد پر صرف رہروی ہی نہیں بلکہ رہبری تک کے لیے آمادہ ہو جائے۔ ایسے لوگوں سے کسطرح یہ حسنِ ظن قائم کیا جا سکتا ہے کہ عامۂ مسلمین کی قیادت اگر پوری طرح ان کے ہاتھ میں آ جائے اور ان کا کامل اتباع کیا جانے لگے تو ترکی، ایران، عراق کے ارباب حل و عقد کی طرح یہ اپنے ملک کے مسلمانوں کی گمراہی کا سبب نہ بنیں گے۔ م

حکومتوں میں اور نیز مرکزی حکومت یا گورنمنٹ آف انڈیا میں ہندوؤں اور غیر مسلموں کی اکثریت ہو اور جو قوانین یہ حکومتیں بنائیں انکے ماتحت مسلمان زندگی بسر کریں۔ یہ ضرور ہے کہ اس صورت میں مسلمان اقلیت ہندو اکثریت سے اپنے مذہبی شعائر اور مذہبی قانون کے لیے خاص تحفظات حاصل کرلے گی تب وہ اس نظام پر راضی ہونگے۔

مسلم لیگ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جو کچھ بھی وثائق ہندو اکثریت مسلمان اقلیت کے لیے ان کے مذہبی شعائر کی بابت دینے کے لیے تیار ہو جاوے اسکا کیا اطمینان ہو سکتا ہے کہ با اختیار بننے کے بعد ہندو اکثریت ان وثائق پر قائم رہیگی اور شعائر اسلام کو توڑنے اور ان کو نیست و نابود کرنے کی کوشش نہیں کریگی۔ اس لیے مسلم لیگ کی یہ تجویز ہے کہ جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے ان کی علحدہ حکومتیں قائم کی جائیں اور یہ کسی مرکزی حکومت کی ماتحت نہ ہوں تاکہ کم از کم مسلمانوں کی اکثریت والے صوبوں میں مسلمان شعائر اسلامی کو قائم رکھ سکیں۔ وہ صوبے جن میں مسلمان اقلیت میں ہیں ان میں وہ اقلیت میں رہیں اور ہندو اکثریت کے ساتھ اشتراک عمل کر کے نظام حکومت قائم کریں۔ ان مسلمانوں کے لیے وہ خطرہ ضرور قائم رہتا ہے جو کل مسلمانوں کے لیے ہوتا اگر کل ہندوستان کا ایک واحد نظام حکومت بنایا جاتا، مگر اس کا تحفظ کسی حد تک اس طرح ہو جاتا ہے کہ جب ملک میں کم از کم چار صوبے ایسے ہیں کہ جن میں مسلمان اکثریت میں ہیں تو وہ صوبے جن میں ہندو اکثریت میں ہیں مسلمان اقلیت کے ساتھ بالکل بیباکی اور بے خوفی کے ساتھ برا طریقہ عمل غالباً اختیار نہ کرینگے۔

بہرحال اقلیت والے صوبوں میں مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کی اس سے زیادہ بہتر اور کوئی صورت مسلم لیگ کے ارباب حل و عقد کی سمجھ میں نہیں آئی۔ گو میں مسلم لیگ کی پاکستانی اسکیم کی تائید کرتا ہوں چونکہ میرے خیال میں مسلمانوں کی اکثریت اسکی موید ہے، مگر میری ذاتی اسکیم اس باب میں یہ ہے کہ موجودہ صوبوں میں سے جن صوبوں میں مسلمان اکثریت میں ہیں وہاں وہ اکثریت میں رہیں اور جہاں اقلیت

میں ہیں وہاں اقلیت میں رہیں اور ان سب صوبوں کو زیادہ سے زیادہ حکومت خود مختاری دی جائے مگر مرکز کو بالکل ہی نہ اڑا دیا جاوے، بلکہ مرکز بھی قائم رہے۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ مرکز میں قلیل اقلیتوں مثلاً عیسائیوں، پارسیوں، سکھوں کو انکی آبادی کے تناسب سے نمایندگی دینے کے بعد باقی مرکز کی نمائندگی مسلمانوں میں اور ہندؤوں میں برابر تقسیم کی جاوے۔ اس اسکیم کا یہ فائدہ ہے کہ مرکز میں چونکہ نہ ہندؤں کی اکثریت ہوگی نہ مسلمانوں کی تو مرکز نہ ان صوبوں پر جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے ہندؤں کے مفاد کے خلاف بے جا دباؤ ڈال سکیگا نہ مسلمانوں کے مفاد کے خلاف ان صوبوں پر جن میں ہندؤں کی اکثریت ہے بے جا دباؤ ڈالا جا سکیگا۔ اس اسکیم کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ ملک چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں یا ریاستوں میں تقسیم نہیں ہو جاتا بلکہ اسکی موجودہ وحدت قائم رہتی ہے اور پاکستانی اسکیم کے جو مفاد ہیں وہ بھی بحالہ قائم رہتے ہیں۔ اس اسکیم پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ مرکز کا ہیڈ یا پریزیڈنٹ اور ملک کی کل فوج کا کمانڈر انچیف بہرحال ایک ہی ہو اکریگا اور مسلمان اور ہندو کبھی اس بات پر متفق نہیں ہونگے کہ وہ پریزیڈنٹ یا کمانڈر انچیف مسلمان ہو یا ہندو۔ یہ مشکل کوئی ایسی مشکل نہیں جو قابل حل نہ ہو۔ مثلاً یہ مشکل اس طرح حل کی جا سکتی ہے کہ ہندو مسلمانوں میں یہ طے ہو جاوے کہ مرکز کا یہ پریزیڈنٹ اور کمانڈر انچیف اگر ایک مرتبہ ہندو ہو تو دوسری مرتبہ مسلمان اور جب پریزیڈنٹ ہندو ہو تو کمانڈر انچیف مسلمان ہو اور جب کمانڈر انچیف ہندو ہو تو پریزیڈنٹ مسلمان۔ (مجھکو اس بات کے تسلیم کرنے میں کچھ بھی تامل نہیں ہے کہ میری یہ اسکیم مولانا مودودی صاحب کی بین الاقوامی وفاق والی اسکیم سے بڑی حد تک ماخوذ ہے[۱])۔

لہٰذا خواہ مسلم لیگ کی پاکستانی اسکیم اختیار کی جاوے یا میری مندرجہ بالا اسکیم، یہ واضح رہے کہ مسلم اکثریت والے صوبوں میں بھی (یہ میں اپنے قیاس سے کہتا ہوں مسلم لیگ کا کوئی اعلان اس بابت میرے پاس نہیں ہے اگرچہ اس قیاس کی صحت پر مجھکو یقین واثق ہے) حکومت جو قائم ہوگی

[۱] یہ امر قابل ذکر ہے کہ ہندوستان کی قوموں کے درمیان منصفانہ تصفیہ (۱۴۵) کی جو تجویز میں نے سیاسی کشمکش حصہ دوم میں پیش کی تھی وہ خان بہادر صاحب

وہ خالص مسلمانوں کی حکومت نہیں ہوگی۔[1] اس میں غیر مسلم آبادی بھی شریک اور حصہ دار اسی طرح ہوگی جیسے مسلم اقلیت والے صوبوں میں مسلم اقلیت غیر مسلم اکثریت کے ساتھ حکومت میں حصہ دار ہوگی۔ اس مسلم اکثریت کو اختیار رہوگا کہ جو نظام حکومت ان صوبوں میں قائم کیا جاوے وہ ایسا ہو کہ مسائل اسلامی میں غیر مسلم ارکان حکومت کو کوئی دخل نہ ہو۔ باقی مشترکہ مسائل کل کابینہ یا پارلیمنٹ کی رائے سے طے ہوں۔ جس سے یہ ظاہر ہے کہ خواہ مسلم اکثریت والے صوبے ہوں یا مسلم اقلیت والے صوبے خواہ مسلم لیگ والی اسکیم اختیار کی جاوے یا کانگریس والی ہر صورت میں مسلمانوں کو غیر مسلموں کے ساتھ آئندہ حکومت میں اشتراک عمل کرنا ہوگا۔

کیا مسلمانوں کا غیر مسلموں کے ساتھ اشتراک عمل ناجائز ہے؟

لیکن کیا مسلمانوں کے لیے اس طرح غیر مسلموں کے ساتھ اشتراک عمل ناجائز ہے؟ یہ سوال میں نے اس لیے اٹھایا کہ علماء کا ایک گروہ ایسا بھی ہے جو اس طرح کے اشتراک عمل کو مسلمانوں کے لیے ناجائز خیال کرتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اسلامی حکومت اگر قائم ہو تو وہ خالص اسلامی ہونا چاہیے۔ غیر مسلم اگر اس میں رہیں تو وہ بطور محکوموں اور ذمیوں کے رہیں۔ کسی ایسی حکومت کو وہ مسلمانوں کے لیے جائز نہیں سمجھتے جس میں مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلم بھی حکومت میں حصہ دار ہوں۔[2] نیز ان بزرگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ ایک شخص باوجود جملہ مہمات دین پر ایمان لانے کے اس وقت تک کامل الایمان مسلمان نہیں ہوتا جب تک کہ وہ ایک خالص اسلامی

---

[1] اور ظاہر ہے کہ اس کا اسلامی حکومت ہونا اور بھی زیادہ بعید از امکان ہے۔ م

[2] مجبوری کے حالات میں محض ایک دور عبوری (Transitional period) کی حیثیت سے ایسے نظام حکومت کو گوارا کیا جا سکتا ہے جس کا آپ ذکر فرما رہے ہیں، بشرطیکہ اس میں مسلمانوں کو کم از کم وہ تہذیبی خود اختیاری Cultural autonomy حاصل ہو جس کو میں اپنی کتاب مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ دوم میں مفصلاً بیان کر چکا ہوں۔ لیکن یہ چیز مسلمان کا نصب العین نہیں بن سکتی۔ اسلام وہ حکومت چاہتا ہے جس کی بنیاد خالص اسلامی نظریہ سیاسی، اسلامی اصول اخلاق اور اسلامی قانون پر ہو۔ اور ظاہر ہے کہ ایسی حکومت کو صرف اہل ایمان ہی چلا سکتے ہیں۔ م

حکومت نہ قائم کرلے یا اگر زمین پر کوئی خالص اسلامی حکومت پہلے سے قائم ہے تو وہ شخص اُس حکومت کی طرف ہجرت نہ کر جاوے یا اس کا ممبر نہ بن جاوے۔[1] جب ان بزرگوں کی خدمت میں یہ عرض کیا جاتا ہے کہ حضورؐ کے حکم سے مسلمانوں کے دو گروہ ہجرت کر کے حبشہ میں گئے جہاں کا بادشاہ اس وقت غیر مسلم عیسائی

---

[1] یہ مسئلہ کی بالکل غلط تعبیر ہے۔ کوئی یہ نہیں کہتا کہ "آدمی کامل الایمان نہیں ہوتا جب تک وہ خالص اسلامی حکومت قائم نہ کرلے"۔ اور آخر کوئی مسلمان ایسا خیال کس طرح کر سکتا ہے جبکہ حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت لوطؑ اور حضرت موسیٰؑ جیسے جلیل القدر پیغمبروں نے زندگی کا ایک بڑا حصہ، اور حضرت مسیحؑ اور حضرت یحییٰؑ جیسے انبیاء کرام نے پوری زندگی غیر اسلامی حکومتوں کے تحت گذاری۔ اگر انبیاء بھی کامل الایمان نہ ہونگے تو اور کون ہوگا۔ البتہ جو کچھ علماء حق کہتے ہیں وہ یہ ہے کہ مسلمان کا دین اس وقت تک کامل نہیں ہوتا جب تک کہ وہ مومن باللہ اور مسلم للہ نہ ہو جائے۔ یہ ایک قاعدۂ کلیہ ہے جس میں کوئی استثناء نہیں۔ اب اگر کوئی مومن اپنے ارادے کے بغیر کسی ایسی جگہ اپنے آپکو پاتا ہے جہاں غیر اللہ کا حکم جاری ہوتا ہو اور جہاں کے نظام تمدن و سیاست کا تقاضا یہ ہو کہ آدمی مسلم لغیر اللہ ہو کر رہے تو اس صورت میں مومن کی سخت آزمائش ہے۔ اگر وہ مسلم لغیر اللہ ہونے پر راضی اور مطمئن ہے اور اس صورت حال پر کوئی بے چینی تک اپنے دل میں محسوس نہیں کرتا تو اس کا مومن باللہ ہونا بھی سخت مشکوک ہے۔ اور اگر وہ اس صورتِ حال پر راضی تو نہیں ہے لیکن اسکو بدلنے کے لیے عملاً کوئی سعی و جہد بھی نہیں کرتا، نہ ہجرت ہی کرتا ہے تو وہ ناقص الایمان اور ظالمٌ لنفسہٖ قرار پاتا ہے۔ اور اگر وہ مسلم لغیر اللہ ہونے سے انکار کر دیتا ہے اور اس غیر الٰہی نظام تمدن و سیاست کو الٰہی نظام سے بدلنے کے لیے عملاً مجاہدہ کرتا ہے تو اس کا دین کامل اور اسکا ایمان بالکل سالم ہے خواہ وہ اس نظام کو بالفعل بدل دینے میں کامیاب ہو یا نہ ہو۔ اس آخری صورت میں اُسکا غیر مسلم حکومت کے اندر رہنا یہ معنی نہیں رکھتا کہ وہ مسلم لغیر اللہ ہے، بلکہ اسکی مثال اسیر جنگ کی سی ہے۔ اگر وہ اس حالت میں شریعت کے بعض احکام پر عمل کرنے سے مجبوراً قاصر رہتا ہے یا کفار کے بعض احکام کا اجراء مجبوراً اپنے اوپر برداشت کرتا ہے تو اسکے دین و ایمان پر کوئی حرف نہیں آتا۔ یہ تینوں صورتیں جو میں نے بیان کی ہیں، انکی تصریح قرآن میں موجود ہے۔ اور ان کے علاوہ ایک چوتھی صورت بھی ہے جسکا ذکر حدیث میں آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ آدمی جب اپنے گرد و پیش کفر و فسق کا غلبہ

(بقیہ صفحہ ۱۴۸ پر)

تھا اور اس کی حکومت میں یہ مسلمان رہے اور اس ملک کے قانون کی پابندی کی یا حضور[۵] کی ہجرت مدینہ سے پہلے کچھ مسلمان ہجرت کر کے مدینہ گئے اور وہاں جیسی کچھ بھی حکومت قائم تھی اسکے احکام کی پابندی ان مسلمانوں نے کی تو کیا یہ مسلمان کامل الایمان مسلمان نہیں تھے؟ تو اسکے جواب میں ارشاد ہوتا ہے کہ یہ صورت حضور کی ہجرتِ مدینہ اور آیاتِ جہاد کے نزول سے پہلے کی تھی۔ حضور کی ہجرت مدینہ کے بعد اور آیاتِ جہاد کے نزول کے بعد یہ سب صورتیں ناجائز ہیں[۱]۔ یہ سب ایسے سوالات ہیں کہ ان کی بابت علماء کو اپنی فیصلہ کن رائے دینا چاہیے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۷) دیکھے اور اپنے اندر اس حالت کو بدلنے کی طاقت نہ پائے تو اس سرزمین سے نکل کر جنگلوں اور پہاڑوں کی طرف چلا جائے اور وہاں بکریوں کا دودھ اور درختوں کے پتے کھا کر زندگی گذار دے۔ ایسا شخص بھی کامل الایمان ہے۔ م

[۱] آپ نے شاید کسی کم علم آدمی کے سامنے اپنا یہ اعتراض پیش کیا ہوگا اور اس بیچارے نے ناواقفیت کی بنا پر یہ بات بنائی ہوگی۔ درحقیقت آپکے اس اعتراض میں قیاس مع الفارق کا مغالطہ چھپا ہوا ہے جسکی طرف سطحی نظر رکھنے والوں کی نگاہ نہیں جاتی اسلیے وہ غریب کسی نہ کسی طرح پہلو بچا کر نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ حبش کی طرف مسلمانوں کی ہجرت اور اسی طرح یثرب کی طرف ابتدائی ہجرت کو اس حالت پر قیاس کر رہے ہیں جس میں آپ خود اس وقت مبتلا ہیں۔ حالانکہ دونوں میں خواہ صوری مشابہت ہو مگر حقیقت اور جوہر کے اعتبار سے عظیم الشان فرق ہے۔ اُس وقت مسلمان اللہ کا کلمہ بلند کرنے اور کفر کا غلبہ مٹا کر دینِ حق کا بول بالا کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا رہے تھے۔ اس حالت میں جب کفار کا ظلم و ستم انکی حدِ برداشت سے زیادہ ہو گیا تو انہوں نے اپنے گرد و پیش نظر دوڑانی شروع کی کہ دنیا کے اس کفرستان میں کونسی ایسی جگہ ہے جہاں نسبتاً محفوظ و مامون ہو کر ہم اعلائے کلمۃ اللہ کی جدوجہد زیادہ کامیابی کے ساتھ کر سکتے ہوں۔ اس غرض کے لیے پہلے حبش پر انکی نظر گئی، چنانچہ وہ وہاں ہجرت کر کے گئے، اور بعد میں نجاشی کے رویہ نے ثابت کر دیا کہ ان کا انتخاب غلط نہ تھا۔ پھر اللہ نے یثرب کا اور بھی زیادہ بہتر موقع ان کے لیے پیدا کیا اور انہوں نے اس سے فائدہ اٹھا کر اس مقام کو اپنی جدوجہد کے مرکز کی حیثیت سے منتخب کر لیا۔ کہاں یہ بات، اور کہاں یہ کہ آپ نہ تو کفار کو ایمان باللہ و اسلام للہ کی طرف دعوت دیں، نہ اس کا فرانہ نظام تمدن و سیاست کو اسلامی نظام تمدن و سیاست

(بقیہ صفحہ ۱۴۹ پر)

راقم الحروف کی جو کچھ رائے اس باب میں ہے (اسکی جو کچھ بھی وقعت ہو) وہ ہدیۂ ناظرین کی جاتی ہے۔ راقم الحروف کے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے کہ جن احکام کے ماتحت مسلمان حبشہ کو ہجرت کر کے گئے اور وہاں ایک غیر مسلم حکومت کے ماتحت رہے، یا جو مسلمان حضور کی ہجرت سے پہلے مدینہ کو ہجرت کر کے گئے اور ایک غیر مسلم نظام حکومت کے ماتحت رہے، یا حضورؐ کے مدینہ کو ہجرت کر کے تشریف لے جانیکے بعد مسلمانوں میں اور مدینہ کے یہود میں معاہدہ ہوا اور اس معاہدہ کے مطابق کچھ عرصہ تک مدینہ کا نظام حکومت چلا[1] اور جسکو مسلمانوں نے نہیں بلکہ یہود نے توڑا، یہ سب احکام وقتی تھے۔ بلکہ یہ احکام اس لیے دیے گئے تھے کہ شارع اسلام کے علم میں مسلمانوں کو ایسی ہی صورتیں آئندہ بھی پیش آنے والی تھیں اس لیے یہ احکام اور مسلمانوں کا اس وقت کا عمل اس لیے تھا کہ اس قسم کی آئندہ پیش آنے والی صورتوں میں مسلمانوں کے لیے شمع راہ کا کام دیں۔ مثلاً اگر اس وقت کسی مسلمان مبلغ کی تبلیغ کے اثر سے انگلینڈ یا جرمنی میں کچھ لوگ مسلمان ہو جاویں (جیسا کہ ہو رہے ہیں) اور سب مہمات دین پر ایمان لے آویں تو کیا وہ اس وقت تک

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۸) سے بدلنے کے لیے جدوجہد کریں، نہ اس راہ میں کوئی تکلیف، کوئی نقصان، کوئی مصیبت اٹھائیں، بلکہ یہ سب کچھ کرنے کے بجائے کفرستان میں مزے سے زندگی بسر کریں اور اسی کافرانہ نظام کے اندر اپنے لیے اور زیادہ آرام دہ جگہ پیدا کرنے کے نقشے سوچیں۔ کیا پہلی حالت اور اس دوسری حالت میں فی الواقع کوئی مماثلت ہے، کہ ایک کو دوسری کے لیے دلیل جواز بنایا جا سکے؟ م

[1] یہ بالکل غلط ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے معاہدہ کر کے کوئی مشترک نظام حکومت بنایا تھا جس کے تحت ابتداءً مدینہ کا انتظام رہا ہو۔ بلکہ واقعہ جو کچھ ہے وہ یہ ہے کہ حضورؐ نے مدینہ تشریف لے جاتے ہی انصار کی آبادی کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا اور خالص اسلامی حکومت کی بنا ڈال دی۔ پھر اس حکومت کی جانب سے یہودیوں کے ساتھ اس قسم کا ایک معاہدہ کیا جس میں ایک طرف بیرونی حملوں کے مقابلہ میں مشترک مدافعت کی شرائط تھیں اور دوسری طرف یہ طے کیا گیا تھا کہ یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان ہمسائیگی کے تعلق کی بنا پر جو معاملات پیش آئیں گے ان کا تصفیہ کس طرح ہوگا۔ اس کی نوعیت دراصل دو خود مختار حکومتوں کے معاہدہ دوستی و معاونت کی سی تھی نہ کہ ایک مشترک نظام حکومت کی۔ م

کامل الایمان مسلمان نہیں ہونگے جب تک کہ وہ انگلینڈ اور جرمنی کی موجودہ حکومتوں کو بدل کر ان ملکوں میں خالص اسلامی حکومتیں نہ قائم کر دیں یا جب تک کہ وہ ان ممالک سے ترک سکونت یا ہجرت کر کے کسی ایسے مرکز میں جہاں خالص اسلامی حکومت ہو جو صحیح معنوں میں خلافتِ راشدہ کہلانے کی مستحق ہو (گو ہماری بد قسمتی سے اس وقت کوئی اسلامی حکومت بھی ایسی نہیں ہے جو صحیح معنوں میں خلافت راشدہ کہلانے کی مستحق ہو) نہ چلے آویں؟ لیکن اگر کوئی ایسا اسلامی مرکز موجود بھی ہوتا یا موجودہ اسلامی سلطنتوں میں سے کسی کو (مثلاً سعودی حکومت کو جو حجاز میں ہے) ہم ایسا مرکز مان بھی لیں تو کیا یہ قابل العمل پالیسی ہو سکتی تھی یا ہو سکتی ہے کہ چین، ہندوستان، ایران، ترکستان سب جگہ سے مسلمان ہجرت کر کے حجاز عرب میں چلے جاویں؟ اگر اس طرح ہجرت کرنا مسلمانوں پر لازم کر دیا جاوے تو وہ تکلیف مالا یطاق کے مترادف ہوگا۔[1]

یہ ضرور ہے کہ مسلمانوں کے لیے یہ بہت افضل اور اعلیٰ ہے کہ وہ وحدت اسلامی قائم کرنے کی

[1] افسوس ہے کہ آپ اس معاملہ میں تو اسلامی احکام ہی سے واقف ہیں، اور نہ کسی چیز کے قابلِ عمل ہونے یا کسی تکلیف کے مالا یطاق ہونے ہی کے متعلق آپکا معیار اسلامی معیار ہے۔ اسلام نے مسلمان کے لیے تین ہی صورتیں رکھی ہیں۔ یا تو وہ دار الکفر کو دار الاسلام بنانے کی کوشش کرے، یا دار الاسلام موجود ہو تو اسکی طرف ہجرت کر جائے، یا اگر دار الاسلام موجود نہ ہو تو جنگلوں کی طرف ہجرت کر کے اپنا ایمان بچائے۔ باقی رہی یہ صورت کہ دار الکفر میں اطمینان سے رہیے اور غیر اللہ کے قوانین پر زندگی بسر کیجیے، اور اسی ماحول میں نسلیں پیدا کیجیے جو کفر و الحاد کے عقیدے اور فسق و فجور کے اخلاق و خصائل لے کر اٹھیں، تو اسکا جواز کتاب و سنت میں تلاش کرنا فضول ہے۔ آپکے نزدیک پہلی تینوں صورتیں ناقابل عمل اور تکلیف مالا یطاق ہیں، اور قابلِ عمل و ما یطاق صرف آخری صورت ہی ہے۔ مگر آپکو معلوم نہیں کہ مومن کے لیے مرجانا قابلِ عمل اور ما یطاق ہے اور یہ آخری صورت بالکل ناقابلِ عمل اور اسکی طاقتِ برداشت سے باہر ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک راستباز آدمی کے لیے فاقہ کرنا اور بھوکوں مرجانا آسان اور قابلِ برداشت ہے مگر چوری کرنا مشکل اور قطعی ناقابلِ برداشت۔ برعکس اسکے دوسرے لوگوں کے لیے واقعی فاقہ نہیں بلکہ صرف اسکا امکانی خطرہ ہی اس قدر ناقابل برداشت ہوتا ہے کہ وہ چوری کے قابل عمل طریقہ پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ آپ قابل عمل و ناقابلِ عمل اور ما یطاق و مالا یطاق کو متعین امور سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ اضافی و نسبی چیزیں ہیں — م

کوشش کریں اور جہاں تک ہوسکے ایک مرکز کے تابع بنیں، مگر جب ایسا کرنا عملاً ممکن نہ ہو اس صورت میں مسلمانوں کے لیے ان سب طریقوں پر رہنا اور زندگی بسر کرنا بالکل جائز ہے جن مختلف طریقوں پر مسلمانوں نے حضور اقدس کے زمانہ میں زندگی بسر کی۔ کیونکہ ہر زمانہ میں مسلمانوں کو ایسے مواقع بھی پیش آوینگے اور آرہے ہیں کہ ان میں سے بعض ایسی جگہ ہوں جہاں اونکی مظلومی اور مقہوری کی حالت ہو اس لیے اگر وہاں سے وہ سلامت ہجرت کر کے نہیں جاسکتے تو انکو اس حالت میں اس قسم کی زندگی بسر کرنا ہوگی جس طرح ہجرت نبوی سے پہلے مسلمانوں نے مکہ میں بسر کی۔ اسی طرح مسلمانوں کو ایسے مواقع بھی پیش آوینگے اور آرہے ہیں کہ ان کو غیر اسلامی حکومتوں کے ماتحت زندگی بسر کرنا ہوگا (کیونکہ ایسے مقاموں سے کل مسلمانوں کا ہجرت کر کے مرکز اسلام کی طرف چلا جانا ہر وقت قابل العمل نہیں ہے)۔ اس وقت انکو اس طرح زندگی بسر کرنا ہوگی جیسی کہ مسلمانوں نے حبشہ میں بسر کی تھی۔ اسی طرح ایسی صورتیں بھی پیش آوینگی جیسی کہ آجکل ہندوستان میں پیش ہیں جہاں مسلمانوں کو غیر مسلموں کے ساتھ رہ کر اور اشتراک عمل کر کے زندگی بسر کرنا ہوگی جیسی کہ انہوں نے ہجرت کے ابتدائی زمانہ میں مدینہ منورہ میں یہود کے ساتھ اشتراکِ عمل کر کے بسر کی۔[ل] اسی طرح مسلمانوں کو ایسے مواقع بھی پیش آوینگے جہاں ان کو جہاد فی سبیل اللہ کرنا ہوگا اور تن من دھن کی بازی لگانا ہوگی۔ ایسے مواقع پر مسلمانوں کا جو عمل اور رویہ حضورِ انور کے زمانہ کے غزوات اور خلفائے راشدین کے زمانہ کے غزوات میں تھا اسی کی پیروی مسلمانوں کو کرنی ہوگی۔ یہ بات بھی یاد رہے کہ مسلمانوں کو اگر تبلیغ کا کوئی موقع مل سکتا ہے تو وہ اسی صورت میں مل سکتا ہے کہ ان کو غیر مسلموں میں رہ کر ان کے درمیان

ل افسوس ہے کہ آپکی ساری تمثیلیں غلط ہیں۔ مکہ کی مثال اُس حالت میں چسپاں ہوسکتی ہے جب آپ اللہ کے راستہ کی طرف دعوت دیں اور جواب میں پتھر کھائیں اور ریت پر گھسیٹے جائیں۔ ہجرت حبشہ کی مثال اُس حالت پر راست آسکتی ہے جب آپ راہِ خدا میں جدوجہد کرتے ہوئے حبشہ جیسے کسی ملک کی طرف پسپا ہوں۔ اور مدینہ منورہ کے معاہدہ کی مثال اُس حالت پر صادق آتی ہے جب آپکی جدوجہد اس منزل پر پہنچے کہ بین الاقوامی معاہدہ کرنا آپکے لیے ممکن ہو۔ م

زندگی بسر کرنے کی اجازت ہو۔ اگر مسلمانوں کو اس کی اجازت نہ ہو، اگر مسلمانوں کے لیے غیر مسلم حکومتوں کے ماتحت یا غیر مسلموں کے ساتھ اشتراک کر کے ایک مشترکہ حکومت میں رہنا ناجائز ہے تو مسلمانوں کو کیسے موقع مل سکتا ہے کہ وہ غیر مسلموں میں تبلیغ کا کام کر سکیں؟ [۱] خلافت راشدہ اور اس کے بعد کی بنی امیہ اور عباسی خلافتوں کے زمانہ میں مسلمان غیر مسلم علاقوں میں اگر گئے تو ہمیشہ فاتح کی حیثیت ہی سے نہیں گئے۔ مشرقی ہند کے جزائر مثل سماٹرا، جاوا، بورینو وغیرہ میں مسلمان کبھی فاتح کی حیثیت سے نہیں گئے۔ نہ مشرقی اور جنوبی چین میں مسلمان کبھی فاتح کی حیثیت سے گئے۔ ان ممالک میں جو مسلمانوں کی ہزاروں، لاکھوں بلکہ کروڑوں کی آبادی ہے یہ انہیں مسلمانوں کی مساعی جلیلہ کا نتیجہ ہے جو ان ممالک میں بحیثیت تاجر کے گئے اور وہیں بس گئے [۲] اور اپنے اخلاق حمیدہ اور صفات ستودہ کا اپنے ماحول پر ایسا اثر ڈالا کہ اکثر مقامات کی کل کی کل آبادی مسلمان ہو گئی جیسا کہ مشرقی بحر ہند کے اکثر جزائر کا حال ہے۔ ہندوستان میں بھی جتنا کچھ بھی اسلام پھیلا وہ مسلمان بادشاہوں اور فاتحین کی کوششوں کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ مسلمان مشائخ اور اہل دل کی مساعی کا

[۱] غالباً یہ سب کچھ اس تخیل کے تحت ارشاد ہو رہا ہے کہ آپ کے نزدیک اسلام بھی عیسائیت یا بودھ مت کی طرح کا کوئی مذہب ہے، اور اسلام کی تبلیغ محض مشنریوں کے پرچار کی سی حیثیت رکھتی ہے۔ حالانکہ اسلام انسانی زندگی کے پورے اعتقادی، اخلاقی، تمدنی، سیاسی، معاشی نظام کو بدل ڈالنا چاہتا ہے اور اس کی تبلیغ کی نوعیت مشنری کام کی سی نہیں بلکہ انقلابی جدوجہد کی سی ہے۔ اگر یہ پر خطر کام جناب کرنے کے لیے تیار ہوں تو غیر مسلموں کے درمیان رہنے اور غیر مسلم حکومتوں کے حدود میں قیام کرنے کے لیے آپ تو محض اجازت ہی مانگتے ہیں مگر میں اس کا حکم نکال کر دکھانے کے لیے تیار ہوں۔ -م

[۲] مسلمانوں کو تجارت کے لیے یا دوسرے کاموں کے لیے دار الاسلام سے دار الکفر اور دار الحرب میں جانے کی اجازت ہے۔ مگر شاید آپ کو ان احکام فقہی کی خبر نہیں کہ دار الاسلام کی رعایا میں سے کسی شخص کو وہاں مستقل قیام کی اجازت نہیں ہے بلکہ ایک معین مدت کے اختتام پر لازم کیا گیا ہے کہ وہ دار الاسلام کی طرف واپس آئے۔ نیز مسلمان کے لیے وہاں نسل کشی کو مکروہ ٹھیرایا گیا ہے کیونکہ اس میں یہ خطرہ ہے کہ مسلمان کی اولاد اہل کفر کے اخلاق پر اٹھیگی۔ بعد کے مسلمانوں نے اگر اس کے خلاف عمل کیا تو برا کیا۔ -م

نتیجہ ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ممالک متوسط آگرہ و اودھ جو اسلامی حکومت کا صدیوں تک گہوارہ رہے وہاں کی مسلمانوں کی آبادی ۱۵ فی صدی سے زائد نہیں ہے اور بنگال کی ۵۶ فی صدی ہے۔ اس لیے مسلمانوں کا غیر مسلموں کے ساتھ رہنا بسنا انکے ساتھ اشتراک عمل کرنا جائز ہی نہیں بلکہ ضروری بھی ہے۔

صد شکر کچھ تو اُن سے ہوئی آج گفتگو
یہ اور بات ہے کہ حریفانہ ہوگئی

وماعلینا الا البلاغ۔

اعلان

مولانا کی مشہور تصنیف "تنقیحات" عرصہ چھ سات ماہ سے ختم ہو چکی تھی۔ اور شائقین حضرات بے تابی سے اس کے دوبارہ طبع ہونے کا انتظار فرمارہے تھے۔ الحمدللہ کے اب یہ کتاب دوبارہ چھپ کر آگئی ہے اور جن حضرات کی فرمائشیں رجسٹر میں درج تھیں انکو بھیجی جارہی ہے۔ چونکہ کاغذ کی بے حد گرانی کی وجہ سے یہ ایڈیشن صرف ایک ہزار کی تعداد میں شائع ہوا ہے لہذا قارئین کرام اور تاجران کتب جلد از جلد اپنی فرمائشیں بھیجدیں۔ معلوم نہیں اس کے بعد تیسرا ایڈیشن چھپنے کا کب موقع آئے۔ کاغذ کی گرانی کی وجہ سے قیمت میں مجبوراً اضافہ کرنا پڑا ہے۔ امید ہے کہ اسکو محسوس نہ کیا جائیگا۔

قیمت بے جلد عہ۔ مجلد عمہ محصول ڈاک ۳ر خرچ وی۔ پی ۳ر

ملنے کا پتہ

منیجر۔ دفتر ترجمان القرآن۔ لاہور